گلگت سے چترال تک
[ایک فوجی مہم کی سنسنی خیز کہانی]
لیفٹیننٹ ولیم جارج لارنس بینین
ترجمہ:
نور شمس الدین

اپریل 1895ء

گلگت سے چترال تک

(ایک فوجی مہم کی سنسنی خیز کہانی)

لیفٹیننٹ ولیم جارج لارنس بینین

ترجمہ: نور شمس الدین

نام کتاب: گلگت سے چترال تک (ایک فوجی مہم کی سنسنی خیز کہانی)

مصنف: لیفٹیننٹ ولیم جارج لارنس بینین

مترجم: نور شمس الدین

پبلشر: مثال پبلشر، فیصل آباد

سنِ طباعت: 2022ء

تعداد: 500

قیمت: 500روپے

ملنے کا پتہ: نادرن ٹک بنک اینڈ اسٹیشنرز، پولو گراؤنڈ روڈ، نزد مائیکرو فائنانس بنک چترال

ٹائٹل ڈیزائن: عارف علی

پروف ریڈنگ: فخر عالم اور مشہود شاہد

فہرست مضامین

عرضِ مترجم

ریشن میں فرنگیوں کو قیدی بنانے اور جنگ کڑاک اور نصر گول کے بارے میں بڑوں بزرگوں سے اکثر سنتے رہتے تھے۔ پھر کتابوں میں وہی ذکر دیکھ کر عجیب لگا۔ چند سال پہلے جارج رابرٹسن کی کتاب 'Chitral; the story of Minor Siege' ہاتھ لگی مگر کچھ بھی پلے نہیں پڑا۔ وجہ مشکل زبان اور عسکری اصطلاحات کا بے جا استعمال تھی۔ پھر وہی کتاب پروفیسر کریم بیگ کے قلم سے اردو کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئی تو جنگ کڑاک کے بارے میں فرنگیوں کی آرا جاننے کا بچپن کا شوق پھر سے سر اٹھانے لگا۔ وہی جستجو مجھے بینین کی کتاب 'With Kelly to Chitral' تک لے گئی اور سوچنے لگا کہ چند سال پہلے جس طرح میں رابرٹسن کو پڑھنے سے محروم رہا تھا ہو سکتا ہے آج کوئی اور بینین کی کتاب کے ساتھ سر مار رہا ہو۔ اسی سوچ کے ساتھ کتاب ترجمہ کرنے کی ٹھان لی۔

کتاب کی تلاش شروع کر دی اور آکسفورڈ میں عبدالواحد کو آواز دی۔ خوش قسمتی سے چند دنوں میں کتاب ہاتھوں میں آگئی مگر ترجمے کا کام شروع پھر بھی نہیں کر سکا۔

2019 میں تلاش رزق گلگت لے گئی۔ درہ شندور سے آنا جانا معمول بن گیا تو کیلی کی فوج یاد آگئی اور ترجمے کا آغاز کر دیا۔

یہ کام اس بار بھی شاید ممکن نہ ہوتا اگر ابتدائی ترجمے کے دوران لاڈلے نور آساس الدین کی مدد شامل حال نہ ہوتی۔ جہاں ہم دونوں کی 'انگریزی دانی' کم پڑ جاتی ظہور دانش کے واٹس ایپ پر دستک دے دیتا۔ سب سے مشکل مرحلہ عسکری اصطلاحات کو سمجھنا اور انہیں اردو کے قالب میں ڈھالنا تھا۔ جہاں اور جس وقت یہ ضرورت آن پڑی تو کیپٹن اشتیاق اور کیپٹن فہیم کو ہر وقت ہشیار پوزیشن میں پایا۔

اس ساری تگ ودو کے باوجود یہ کتاب آج آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتی اگر فخر عالم، عطا حسین اطہر، احسان شہابی اور شمس الرحمان تاجک کی مدد شامل نہ ہوتی۔ یہی تھے جنھوں نے ترجمے کی نوک پلک سنواری اور اسے قابل اشاعت بنا دیا۔ ساتھ ساتھ استادِ محترم ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی صاحب، عزیز علی داد اور فرنود عالم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی تحریروں سے کتاب کو پڑھنے پر احباب کو اکسانے کی بھرپور کوشش کی۔

تاریخ کا دھارا

نوجوان محقق اور مترجم نور شمس الدین صاحب نے برطانوی فوج کے ایک سابق آفیسر ولیم جارج بینین کی کتاب "ودھ کیلی ٹو چترال" کا اردو ترجمہ کر کے تاریخ اور سماجیات کے طالب علموں کے ساتھ ساتھ چترال میں برطانوی عملداری کے پس منظر اور پیش منظر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نادر اور بیش بہا تحفہ پیش کیا ہے۔ چترال میں اس کتاب کا موضوع سب کے لیے دلچسپی کا باعث بن رہا ہے۔ انگریزوں کی توجہ چترال کی طرف کیوں مبذول ہوئی اور مہاراجہ کشمیر کی وساطت سے چترال کے مہتر امان الملک کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیوں کیا گیا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا مدلل جواب مترجم نے پس منظر کی کہانی میں دیا ہے۔ پس منظر کے باب کو پڑھنے کے بعد کتاب کے سیاق وسباق کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ترجمہ ایک مشکل اور محنت طلب صنف ادب ہے۔ مترجم کا دونوں زبانوں پر عبور ہونا اس کے لیے پہلی شرط ہے۔ زبانوں پر عبور کے ساتھ نفسِ مضمون پر مضبوط گرفت بھی ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی شرط ہے۔ مترجم کے سامنے دو اہم آزمائشیں ہوتی ہیں۔ وہ لفظی ترجمے اور بامحاورہ ترجمے کے درمیان کا راستہ کس طرح اختیار کرتا ہے۔ یہ ابتدائی سوال ہے۔ لفظی ترجمے سے ترجمہ پڑھنے والے کے لیے پُرکشش نہیں رہتا۔ بامحاورہ ترجمے کی صورت میں اصل کتاب کی عبارت کے کم ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اچھا ترجمہ وہ ہوتا ہے جو پڑھنے والے کو ترجمہ کی جگہ طبع زاد کاوش جیسی لگے۔ عبارت میں کوئی جھول نہ آئے اور قاری اس کو پڑھنے میں آسانی اور روانی محسوس کرے۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت محسوس ہوئی کہ مترجم اس آزمائش پر پُورے اُترے ہیں۔ انہوں نے انگریز مصنف کی آپ بیتی کو افسانہ اور کہانی کی طرح دلچسپ پیرایہ اظہار کا جامہ پہنا کر قاری کے سامنے رکھا ہے۔ اس کے لیے نور شمس الدین صاحب شکریہ اور شاباش کے مستحق ہیں۔

1895 کے محاصرہ چترال کو ایک ایسا واقعہ سمجھا جاتا ہے جس نے مقامی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ سیاستِ مدن، بین الاقوامی تعلقات اور معاشرتی مدوجزر پر غور وفکر کرنے والے اس واقعے کو دو پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ مقبول بیانیے کی پیروی کرنے والے علماء، مفکرین اور مصنفین محاصرہ چترال کو انگریز مخالف عوام اور خواص کی طرف سے حریت پسندی کی طرف بڑا اقدام قرار دیتے ہیں۔ عمرا خان، شیر افضل خان، محمد عیسی، دانیال بیگ اور ان کے ساتھیوں کو چترال کے حریت پسند عوام کا اصل ہیرو قرار دیتے ہیں اور اس مفروضے کو درست مانتے ہیں کہ اگر عمرا خان اور شیر افضل اس جنگ میں کامیاب ہو جاتے تو چترال برطانوی ہند کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں نہ ڈالتا۔ اس مقبول بیانیہ کے مقابلے میں دوسرا بیانیہ بھی ہے۔ تصویر کا دُوسرا رُخ دکھانے والے کہتے ہیں کہ عمرا خان اور شیر افضل کا حملہ اگر کامیاب ہو بھی جاتا تو چترال کو افغانستان کا طفیلی بنایا جاتا۔ چترال کابل کا غلام بن جاتا۔ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا چترال اپنی آزادی اُس صورت میں کھو دیتا۔ نتیجے کے طور پر قحط سالی، بے روزگاری، جہالت اور غربت چترال کے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ صدی گزرنے کے باوجود چترال کی حالت آج کے کنڑ، ننگرہار اور نورستان سے مختلف نہ ہوتی۔ پاکستان کا شہری بننا ہمارے نصیب میں

نہ ہوتا۔ جن لوگوں نے عمرا خان اور شیر افضل کے مقابلے میں کم سن شجاع الملک اور دوستی کے معاہدے میں منسلک برطانوی ہند کا ساتھ دیا وہ چترال کو تختِ کابل کی غلامی سے چھڑا کر برطانوی ہند کی بڑی حکومت کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بڑی سلطنت کا حصہ بننے کے بعد سماجی ترقی کے راستے کھلیں گے اور علاقے کی غربت ختم ہوگی۔1876 میں کرنل لوک ہارٹ کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرتے وقت امان الملک نے کھلے دربار میں لوگوں کی رائے لی تو اکثریت نے یہ رائے دی تھی کہ افغانستان، دیر اور باجوڑ میں غربت ہم سے زیادہ ہے۔ان کی دوستی ہمارے کسی کام کی نہیں۔ برطانوی ہند کے وسائل ہم سے زیادہ ہیں۔ان سے دوستی کا معاہدہ ہمارے لیے اور ہماری آنے والی نسلوں کے لیے نفع بخش اور مفید قدم ہوگا۔ چنانچہ 1895 کا معرکہ اس معاہدہ دوستی کا پہلا "غیر حتمی" نتیجہ تھا۔ بینئین کی آپ بیتی اس معرکے کا ایک باب ہے۔کرنل جیمز کیلی کی قیادت میں برطانوی فوج قلعہ چترال میں محصور ہونے والوں کو کمک پہنچانے گلگت سے براستہ شندور چترال پہنچی تو عمرا خان کی فوج نے محاصرہ اٹھالیا۔ چنانچہ کسی مزاحمت کے بغیر قلعے کے دروازے کھول دیئے گئے۔ محاصرین نے 46 دنوں تک قلعے میں بند رہ کر جو صعوبتیں اٹھائی تھیں ان صعوبتوں کا صلہ مل گیا۔آج چترال میں تعلیم، صحت، روزگار اور دیگر شعبوں میں خوشحالی اور ترقی کے جو مواقع دستیاب ہیں ان کے پس منظر میں "وِدھ کیلی ٹو چترال" کی مہم کا بھی نمایاں کردار ہے۔اس طرح بینئین کی کہانی تاریخِ چترال کے ایک فیصلہ کن موڑ کی سچی کہانی ہے۔

عنایت اللہ فیضی
تمغہ امتیاز

میرے دل پر بیتنے والی ایک جنگ بیتی

میرا چترال سے آبائی تعلق نہیں ہے۔اس لیے مجھے اس کتاب پر تبصرہ نہیں کرنا چاہیے۔میرا کتاب کے مترجم سے تعلق ہے۔ اس لیے کچھ نہ کچھ لکھنے کا حق تو مجھے حاصل رہنا چاہیے۔اس حق کا حق دار اس لیے بھی ہوں کہ میں ان قارئین میں سے ہوں جنہوں نے یہ کتاب اشاعت سے پہلے پڑھ لی ہے۔ اس کتاب کے کچھ مقامات تو میں نے کتاب کا دوبارہ ترجمہ ہونے سے بھی بہت پہلے پڑھ لیے تھے۔کوراغ میں کیپٹن روز کے دستے نے ہزیمت اٹھائی تو بھاگ کر اس نے بونی میں پناہ لی تھی۔ہندوکش کے سلسلوں میں سمٹے ہوئے اسی بونی میں کتاب کے مترجم سے میری کئی سنگتیں ہوئیں۔پہلی ہی سنگت میں مترجم نے خبر دی کہ انہوں نے لفٹننٹ ولیم جارج لارنس کی کتاب کا ترجمہ کیا تھا، مگر سارا مواد کمپیوٹر سے اڑ گیا ہے۔یہ سن کر دل بیٹھ سا گیا۔تخلیق کار کی تخلیق کے یوں ضائع ہو جانے کا دکھ وہ ماں سمجھ سکتی ہے جس کے وجود میں پھوٹنے والا غنچہ خوشبو دینے سے پہلے مر گیا ہو۔

اس کے بعد سے کئی دن تک مترجم سے صحبت رہی۔ہم نے ریشن سے لاسپور تک کا سفر ساتھ کیا۔ریشن پہنچ کر بتایا، یہ وہ علاقہ ہے جہاں محمد عیسی نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر لیفٹیننٹ ایڈورڈز اور لیفٹیننٹ فولر کو اپنی قید میں لے لیا تھا۔مستوج سے ذرا پہلے گاڑی سے اتر کر دریا کے اُس پار وہ چٹان بھی دکھائی جس کی آڑ لے کر جارج لارنس نے سامنے کے قلعے میں موجود مورچوں کا نقشہ بنایا تھا۔یہی وہ مقام تھا جہاں گلگت سے چترال کی طرف جانے والی فوج کو مزاحمت کا سامنا ہوا تھا۔

ایک شام ہرچین میں ہم دریا کے کنارے بیٹھے تھے کہ دو دروں کی طرف اشارہ کر کے ایک دوست نے کہا، یہ راستہ ہے جو چترال کے سب سے بڑے نالے بشقر گول کی طرف نکلتا ہے۔یہ دو رات کا پیدل سفر ہے جو یہاں سے کچھ آگے سوڑاسپور سے شروع ہوتا ہے۔پھر مترجم نے کہا، کرنل کیلی کے دستے شندور کے برف زاروں کو عبور کیا تو سیدھا سوڑاسپور میں ہی اترا تھا۔برف کی شدت اور بلندی کی سطح نے ان کی بینائی مار دی تھی۔

اگلے برس جب گلیشئر پگھل رہے تھے اور پھول کھل رہے تھے، میں کچھ فطرت پسند دوستوں کے ساتھ دِیر کے پہاڑوں سے چلا اور آٹھ راتوں میں بشقر گول سے ہوتا ہوا سوڑاسپور پہنچا۔اس ایک برس پہلے انہی دوستوں کے ساتھ سوات سے چھ راتوں کا پیدل سفر کاٹتے ہوئے گلگت کے تقریباً آخری گاؤں ہندراپ میں اترا تھا۔عید کی چھٹیوں میں شمال کے انہی راستوں میں یہاں وہاں بھٹکتا رہا۔ان سب سے گزر کر اب یہ ترجمہ پڑھ رہا ہوں تو کئی حوالوں سے کہانی کا حصہ بنتا چلا جا رہا ہوں۔کہانی پڑھ ہی نہیں رہا، محسوس بھی کر رہا ہوں۔کسی سطر سے گزروں تو مترجم کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔بات پر اضافی گرہ لگاتے ہوئے دوست بھی دکھائی دیتے ہیں۔سو، میں کہہ سکتا ہوں یہ کتاب میں نے پڑھی ہی نہیں ہے، ایک طرح سے مجھ پر بیت بھی گئی ہے۔

کتاب کو پڑھتے ہوئے ایک نیم سیاح (اور پورے دوست) کے طور پر جب دھیرے دھیرے واقعات میں شامل ہو رہا تھا تو ایک جگہ اچانک چونک گیا، ارے یہ کیا؟ کہانی میں تو بیچ کا ایک سیاح نکل آیا۔یہ جارج ہیوارڈ ہے جو دنیا گھومتا ہوا شمال کے پہاڑوں میں پہنچا اور گرفتار ہو گیا۔جنگ چھڑ جائے تو

اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ بے اعتباری کے موسم میں کچھ خواہشیں بے موت ماری جاتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ مترجم سے ایک ملاقات گلگت کے علاقے گاہکوچ میں بھی تو ہوئی تھی۔ عید کی صبح ہم ایک پہاڑی پر بیٹھے تھے جب ایک دوست نے یاسین نامی علاقے کا ذکر چھیڑا۔ مترجم نے بتایا، یہی وہ علاقہ ہے جہاں جارج ہیوارڈ کو قتل کیا گیا تھا۔ اگلے ہی دن میں یاسین پہنچا جہاں دوستوں نے مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے اس واقعے کی مزید تفصیل بیان کی۔ بتایا گیا کہ جارج نے فیصلے والی رات صبح تک کی مہلت مانگی تھی، وہ آخری بار قدرت کے مناظر دیکھنا چاہتا تھا۔ صبح روشنی پھوٹنے کے ساتھ اس کی زندگی کا سورج غروب ہو گیا۔ جنگ کتنی بری چیز ہے۔ سورج قتل ہو جاتے ہیں، چاند تارے ٹوٹ جاتے ہیں۔

یہ کتاب دراصل استعمار کی جارحیت اور دراندازیوں کا روزنامچہ ہے۔ یہ کرنل کیلی کی کمان میں نکلے ہوئے اس دستے کی کہانی ہے جو قلعہِ چترال میں محصور اپنے ساتھیوں کو چھڑوانے کے لیے نکلا تھا۔ یہ کہانی اور بھی دلچسپ ہو سکتی تھی اگر اس دستے کو ہر دو میل کے بعد خون ریز مزاحمت کا سامنا ہوتا۔ دستے میں شامل خون خوار توپچی کیپٹن سٹیوارٹ یہی شکایت کرتا ہوا دنیا سے گزر گیا کہ چترال کے لوگوں نے جنگ کا موقع نہیں دیا۔ کھانے کو ش ایک تو بہت ملا، پینے کو خ``ون نہیں ملا۔

اقبال کی ترتیب میں شمشیر وسناں اوّل ہے اور طاوس ورباب آخر ہے۔ چترال کی ترتیب میں طاوس ورباب اوّل ہے اور طاوس ورباب ہی آخر ہے۔ انہیں بندوق پکڑادو تو یہ خوبانی کا پھول توڑ کر اس کی نال میں اٹکا دیتے ہیں۔ گا ہے یہ ستار کی تاریں ادھیڑ کے بندوق کی نال اور دستے کے بیچ اٹکا دیتے ہیں۔ میدان کی طرف جانے کی بجائے دریا کی طرف نکل جاتے ہیں۔ محبت کے گیت گاتے ہیں اور بہار کے دُھن بکھیرتے ہیں۔ گولی کو سیاہی میں ڈبو کر شعر لکھتے ہیں۔ محنت سے کیے ہوئے ترجمے کا مواد ضائع ہو جائے تو دل چھوٹا نہیں کرتے۔ پھر سے کر دیتے ہیں۔

فرنود عالم
اسلام آباد

تاریخ کے شکاری اور شکار

زیر نظر کتاب کالونیل دور میں ہائی ایشیا کے پہاڑوں میں کھیلے جانے والی گریٹ گیم کے ایک اہم واقعہ "محاصرہ چترال" کے وقت گلگت سے شروع کی جانے والی مہم کی روداد ہے۔ یہ گیم زار روس اور برطانیہ کے درمیان ہندوکش، ہمالیہ، پامیر اور قراقرم کے پہاڑوں میں کھیلی گئی تھی۔ جدید ایمپائرز کی تشکیل میں ایک اہم عنصر نو آباد اور زیردست معاشروں کے متعلق معلومات اکھٹا کرنا اور ڈاکومنٹیشن رہا ہے۔ تاج برطانیہ کے کالونیل انتظام میں دستاویزات اور رپورٹوں کا ایک اہم کردار تھا۔ یہ کتاب ان واقعات پر مشتمل ہے جو کرنل کیلی کی ریلیف فوج کے اسٹاف افیسر لیفٹیننٹ ڈبلیو جی ایل بینین نے قلمبند کیے ہیں۔ گو کہ اس کتاب میں واقعات کو تاج برطانیہ کے نقطہ نظر سے بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ اس دور میں بیرونی طاقتوں کے زیر اثر گلگت اور چترال میں ہونے والے سیاسی داؤ پیچ اور نئے ابھرتے ہوئے کرداروں کو سامنے لاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کے مندرجات سے جو بات عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لداخ سے لے کر چترال تک کے علاقوں کی سیاست، ثقافت اور معاشرت کس طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ اس سے ہمیں کالونیل دور کے ان انتظامی اقدامات اور فیصلوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو اس وحدت کے انتشار کا باعث بنے۔ یہی انتشار تھا جو آج یہاں کے باسیوں کو ہائی ایشیا کی تاریخ اور موجودہ معاملات کو کلی طور پر دیکھنے کے بجائے اپنے محدود علاقائی خول میں دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ کتاب ان واقعات پر مبنی ہے جو چترال کی ریاست میں محلاتی سازشوں کے نتیجے میں قتل وغارت گری کی وجہ سے سیاسی کردار اور خاص طور پر مہتر (ریاست چترال کے حکمران) تبدیل ہوتے رہنے سے پیش آئے۔ اس تحریر سے جو چیز واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اب ہائی ایشیا بشمول چترال کا مقدر علاقائی ریاستوں کی سیاست پر منحصر نہیں تھا بلکہ یہ بازی بزرگ یعنی گریٹ گیم سے جڑا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چترال میں حکمران کی تبدیلی ایک اندرونی معاملہ نہیں رہا بلکہ اس واقعے نے براہ راست تاج برطانیہ کی ہائی ایشیا میں بچھائی گئی سیاسی انتظام کی بساط کو چیلنج کیا۔ اسی لیے تاج برطانیہ نے اپنی عسکری طاقت کو حرکت میں لایا۔ اس مہم میں مقامی سہولت کاروں کا بہت بڑا کردار نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر گلگت سے چترال تک کے اس مشن کے دوران پونیال کے راجہ اکبر خان اور ہنزہ سے وزیر ہمایوں نہ صرف تاج برطانیہ کی مہم کو سہولت پہنچاتے ہیں بلکہ عملی طور پر بندوق ہاتھ میں لے کر انگریز فوجیوں کے شانہ بشانہ چترالیوں کے خلاف لڑتے بھی ہیں۔ یہ واقعات دو چیزوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلی یہ کہ ہنزہ کے وزیر ہمایوں نے ہنزہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ اس لیے دیا تھا کہ راجہ صفدر کی اس کے ساتھ ذاتی دشمنی تھی۔ گلگت سے چترال کی اس مہم میں وزیر ہمایوں کا مستعد کردار اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وزیر ہمایوں نے مقامی ریاست میں اپنا روایتی کردار کھونے کے بعد اپنے آپ کو نئی اور ابھرتی طاقت کے ساتھ ملا لیا تھا۔

دوسری مگر اہم بات جو یہاں نمایاں ہوتی ہے وہ چترال سے لے کر لداخ تک پھیلے معاشرے کی ثقافتی وحدت کا انتشار ہے۔ گلگت میں جب راجہ گوہر امان انیسویں صدی کے وسط میں کشمیر کے ڈوگرہ راج کے خلاف لڑ رہا تھا تو اس کی مدد کے لیے جن جگہوں سے لوگ آئے تھے ان میں چترال کے مہتر کے

بھیجے ہوئے لوگ بھی شامل تھے مگر ہنزہ، نگر، لداخ، بلتستان اور چترال کے انگریزوں کے ہاتھوں میں جانے کے بعد ان علاقوں میں یگانگت کی جگہ انتظامی قطع و برید نظر آتی ہے۔ یہی انتظامی تقسیم علاقے کی سیاسی و ثقافتی وحدت کی تقسیم کا سبب بنی۔ آج کے ہمارے سیاسی مزاج کی تشکیل میں کالونیل دور کے ان انتظامی تشکیلات کا اہم کردار ہے۔ آج گلگت اور چترال والے ایک دوسرے کو اتنا الگ اور جدا سمجھتے ہیں کہ کسی معاملے پر ایک دوسرے کی مدد تو دور، شندور کے تنازعے پر ایک دوسرے سے لڑنے اور کٹ مرنے کو تیار ہوں گے۔ یہ معاشرے اندرونی طور پر اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ وہ اندرونی کالونیل طاقت کے خلاف اُف بھی نہیں کریں گے مگر ایک دوسرے پر شیروں کی طرح غرائیں گے۔ یہ سب کالونیل دور کے اس انتظام، انصرام اور علم کی بدولت ہے جس کے ذریعے ہمیں جسمانی طور پر مطیع کیا گیا اور ذہنی طور پر اپنے بیانیے کا غلام بنایا گیا۔ اس پوسٹ کالونیل غلامی سے نجات حاصل کرنے لیے لازمی ہے کہ ہم اپنی ذہنی زنجیروں کو پہلے توڑیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم گلگت اور چترال کے متعلق کالونیل دور میں پیدا کردہ علم کو تنقیدی طور پر پڑھیں اور اس میں موجود تقسیم اور جڑت کے عوامل کی نشاندہی کریں۔

نور شمس الدین کا یہ ترجمہ ہماری نئی نسل جو کالونیل دور کے متعلق تو مکمل طور پر بے خبر ہے مگر گلوبلائزیشن کا زیادہ شعور رکھتی ہے، کے لیے ایک عظیم تحفہ ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنے اجتماعی تاریخی شعور اور حافظے کی نہ صرف از سر نو تشکیل کر سکیں گے بلکہ اس کی از سر نو تشریح کرنے کے بھی قابل ہوں گے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب اس کتاب کے متن کا ہم اپنے تاریخی تناظر اور ثقافتی حسیت کے ساتھ قرات کریں۔ فوجی مہم جوئی پر مشتمل اس کتاب کا جس سلیس انداز میں اور ادبی اسلوب کے ساتھ نور شمس الدین نے ترجمہ کیا ہے اس پر وہ داد کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے کہ چترال کی نئی نسل اس جیسی کتابوں سے استفادہ کر کے اپنی تاریخ کے متعلق کالونیل علم کی پرچھائیوں کے آثار کو آشکار کرے گی۔ اس طرح سے ہم کلونیل دور میں شکار اور شکاری کی تفریق کر پائیں گے۔

عزیز علی داد

ڈومیال۔ گلگت

پس منظر

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

اُنیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی راج ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد سے ہندوستان میں پنجے گاڑ چکا تھا۔ دوسری طرف زارِ روس وسطی ایشیاء کے جنوب میں اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ روس کے اِن عزائم کو دیکھتے ہوئے برطانیہ کو ہمیشہ سے اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں روس افغانستان یا ہندوستان کے شمال مغرب میں موجود چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں کو تاراج کرتا ہوا ہندوستان پر حملہ نہ کرے۔ بالکل اسی طرح کے خدشات انگریزوں کے متعلق روس کو بھی تھے۔ انہی خدشات نے برطانیہ اور روس کے درمیان چپقلش پیدا کی۔ گو کہ اس دوران کبھی بھی اِن دو عالمی طاقتوں کے درمیان فوجی تصادم نہیں ہوا، تاہم سیاسی اور سفارتی محاذ ہمیشہ گرم رہا اور دونوں طاقتیں اپنے درمیان موجود ممالک خصوصاً افغانستان، ایران اور وسطی ایشیاء سے متصل آزاد ریاستوں مثلاً کشمیر، گلگت، ہنزہ اور چترال کو اپنے مخالف کے تصرف سے بچا کر اپنے کیمپ میں شامل کرنے کے لیے کوشاں رہیں۔ تقریباً ایک صدی پر پھیلی اس محاذ آرائی کو تاریخ میں گریٹ گیم (Great Game) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہندوکش، قراقرم، ہمالیہ اور پامیر کے پہاڑی راستوں کی کھوج اور ان کے ذریعے جاسوسی کرنے کا جو سلسلہ اٹھارویں صدی میں شروع ہو چکا تھا، وہ گریٹ گیم کے دوران زور پکڑا۔ انگریز سرکار کے کارندے ان پہاڑی راستوں کا استعمال بظاہر کاروبار اور سیاحت کے لیے کر رہے تھے مگر ان کا اصل ہدف وہاں کی ریاستوں کی جاسوسی، ان ریاستوں پر روسی اثر و رسوخ کا تجزیہ اور اُن دروں اور گزرگاہوں کی تلاش تھا، جن کے بارے میں انگریز اب تک بے خبر تھے مگر جنہیں روس اِن آزاد ریاستوں یا پھر براہِ راست برطانوی ہند پر ممکنہ حملے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔

اس مشکل ترین کام میں فرنگی اہلکاروں کو اس وقت حیرت کا شکار ہونا پڑتا جب ان دشوار گزار پہاڑوں کے بیچ نئے علاقوں کی دریافت کے ساتھ وہاں ان کو روس کے قدموں کے نشان پہلے سے موجود ملا کرتے[1]۔ انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ دونوں بڑی طاقتوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی بھی طاقت کی جانب سے ممکنہ مہم جوئی کی راہ میں شمال مغرب کے پہاڑ ہی حائل ہو سکتے ہیں، چاہے وہ جنگ شروع کرنے کا معاملہ ہو یا حملہ آوروں کو روکنے کا مسئلہ۔ فرنگی سرکار کے لیے تشویشناک حالات اس وقت پیدا ہو گئے جب وسطی ایشیاء میں تاشقند، سمرقند اور بخارا پر قبضہ کرنے کے بعد روسی حکام پامیر کے دامن میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد سوائے چترال، گلگت یا ہنزہ جیسی کمزور ریاستوں کے، روس کی راہ میں حائل کوئی بڑی رُکاوٹ موجود نہ تھی اور وہ جب چاہے اِن ریاستوں کو روندھتا ہوا براہِ راست ہندوستان پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ اگرچہ 1846 کے بعد کشمیر اپنے خارجہ معاملات فرنگی سرکار کے مطابق چلا رہا تھا تاہم کشمیر کے راستے ہندوستان پر حملے کا خوف اور ریاستِ ہنزہ کی وادیِ شمشال میں جاسوسی کے خفیہ راستوں کی موجودگی انگریزوں کو

---

[1] The Great Game by Peter Hopkrik

چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔1865 میں روسیوں کے پامیر کے پار تک پہنچنے کی خبر کے ساتھ فرنگی سرکار نے حفاظتی انتظامات تیز تر کر دیئے۔ 1877 کے بعد انگریزوں نے گلگت کے معاملات میں براہ راست مداخلت شروع کر دی، وہ نہیں چاہتے تھے وسطی ایشیاء سے متصل کوئی بھی علاقہ روسیوں کے زیرِ اثر چلا جائے۔ اُنیسویں صدی کے آخری عشرے کے ابتدائی سالوں میں گلگت، ہنزہ اور غذر کا پورا علاقہ انگریزوں کے زیر نگیں آ گیا۔ دوسری طرف افغانستان بھی گریٹ گیم کے دوران روسیوں اور انگریزوں کے بیچ اس چپقلش کا میدان رہا۔ انگریزوں نے افغانستان میں کئی بار براہ راست مداخلت کی تاکہ اسے اپنے کنٹرول میں لا سکے مگر حالات اس وقت تک قابو میں نہ آئے جب تک 1880 میں امیر عبدالرحمان بر سر اقتدار نہ آیا۔ عبدالرحمان کو اپنے خارجہ امور ہندوستان کی انگریز سرکار کے مطابق چلانے کے بدلے میں اچھی خاصی مدد مل جاتی تھی۔ افغانستان اور انگریزوں کے تعلقات کا عروج ڈیورنڈ لائن (Duran Line) کی صورت میں سامنے آیا جس کے بعد دونوں ریاستیں نہ صرف ایک دوسرے کی حدود سے واقف ہو گئیں بلکہ حد بندی کی وجہ سے کسی بھی قسم کا اختلاف پیدا ہونے کی گنجائش بھی تقریباً ختم ہو گئی۔

اگرچہ اس واقعے سے آس پاس کی شاہی ریاستیں خوش نہیں تھیں مگر چترال شاید وہ واحد ریاست تھی جو نہ صرف ڈیورنڈ لائن کی حمایت کرتی تھی بلکہ اس مرحلے کے دوران انگریزوں کی ہر ممکن مدد بھی کی اور نتیجتاً انگریزوں اور چترالی ریاست کے تعلقات بہتر ہو گئے۔ اینڈرسن[2] کے مطابق ڈیورنڈ (Mortimer Durand) اور جارج اسکاٹ رابرٹسن (George Scott Robertson) کا 1888ء میں مہترِ چترال امان الملک کی دعوت پر چترال آنا چترال اور انگریزوں کے درمیان بہتر تعلقات کا نقطہ عروج تھا۔

حالات شاید ایسے ہی رہتے اگر چترال کے مہتر امان الملک کے انتقال کے بعد جانشینی کی خونریز کہانی شروع نہ ہو جاتی۔

مہتر امان الملک 1856 میں اس وقت اقتدار میں آئے تھے جب پامیر کے پہاڑوں میں فرنگی اور روسی گریٹ گیم کھیلنے میں مصروف تھے۔ انگریزوں کا آہستہ آہستہ شمالی علاقہ جات پر قبضے اور افغانستان کا انگریزی عملداری میں جانے کے بعد مہترِ چترال فرنگیوں کے ساتھ اچھے تعلقات بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ چترال اور افغانستان کے تعلقات عموماً کشیدہ رہتے تھے۔ امان الملک انگریزوں سے تعلقات قائم کر کے انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش میں تھا کہ چترال سے کوئی باغی افغانستان اور خصوصاً بدخشان کے علاقوں میں پناہ لے سکے اور نہ وہاں سے تختِ چترال کا کوئی سر پھرا دعویدار نمودار ہو کر چترال کے لیے مشکلات پیدا کرے جو کہ ماضی میں عموماً ہوتا آیا تھا۔ مختصراً یہ کہ انگریزوں اور امان الملک کی گٹھ جوڑ اور افغانستان پر فرنگی دباؤ نے امان الملک کو لمبے عرصے تک پُر امن طریقے سے چترال کے سیاہ و سفید کا مالک بنائے رکھا۔

---

[2] The Friends at Gilgit, 1888-95: Algernon Durand and George Scott Robertson by Dorothy Anderson

۳۰ اگست 1892 کو امان الملک کا انتقال ہوتا ہے۔ اس وقت گلگت کا پولیٹکل ایجنٹ میجر جارج اسکاٹ رابرٹسن (George Scott Robertson) تھا[3]۔ امان الملک کا بڑا بیٹا نظام الملک اُس وقت یاسین میں تھا جب تختِ چترال پر امان الملک کا چھوٹا بیٹا افضل الملک اقتدار پر قابض ہو گیا۔ ان حالات کا فائدہ اُٹھا کر امان الملک کے بھائی شیر افضل جو افغانستان میں ملک بدر تھا اور انگریز سرکار کی ہدایت کے مطابق امیرِ افغانستان انہیں چترال پر حملے سے روکنے کے پابند تھے، نے کسی کی پرواہ کیے بغیر چترال پر دھاوا بول دیا۔ شیر افضل، افضل الملک کو قتل کر کے 8 نومبر 1892 کو تختِ چترال پر قابض ہو گئے۔ ان حالات کی خبر نظام الملک کو ہوئی تو وہ انگریزوں کی اشیر باد سے چترال کی طرف روانہ ہوا۔ شیر افضل واپس افغانستان بھاگ گیا اور 3 دسمبر 1892 کو نظام الملک چترال کے حکمران بنے۔

اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نظام الملک نے افغانستان سے کسی بھی متوقع حملے کو انگریزوں کے ذریعے روکنے کی حکمتِ عملی اپنائی۔ بلکہ دو قدم آگے نکل کر انگریزوں کو چترال میں اپنا سفیر تعینات کرنے کی بھی دعوت دی۔

اسی دعوت پر گلگت کے پولیٹکل ایجنٹ میجر رابرٹسن ایک مرتبہ پھر چترال پہنچے اور مئی 1893 میں کیپٹن جارج جان ینگ ہسبنڈ (George John Younghusband) کو چترال میں پولیٹکل افیسر تعینات کر کے خود واپس گلگت چلے گئے۔ اسی سال ماہِ ستمبر میں ینگ ہسبنڈ کو چترال سے مستوج بھیج کر ان کی جگہ لیفٹیننٹ بی ای ایم گورڈن (Bertrand Evelyn Mellish Gurdon) کو ذمہ داریاں دی گئیں۔

نظام الملک کو انگریزوں کی حمایت تو حاصل تھی مگر ان کے اپنے چند بااثر رفقاء شیر افضل سے رابطے میں تھے[4] جس کی وجہ سے نظام الملک کی مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ یکم جنوری 1895 کو نظام الملک اپنے ہی بھائی امیر الملک کے ہاتھوں قتل ہوا اور اسی وقت جندول کے حکمران عمرا خان نے چترال پر چڑھائی کا فیصلہ بھی کیا۔ جندول موجودہ دیر اور باجوڑ کے علاقوں پر مشتمل چترال کے جنوب میں واقع پختون ریاست تھی۔ انگریز نہیں چاہتے تھے کہ چترال میں کسی قسم کی خانہ جنگی یا بدامنی ہو جس کا روس فائدہ اُٹھا کر اپنا پسندیدہ حکمران چترال کے لیے منتخب کرے۔

گریٹ گیم کے اس نازک موڑ پر ایک غیر مستحکم چترال انگریزوں کے مفادات کے خلاف تھا۔

چنانچہ 7 جنوری 1895 کو نظام الملک کے قتل کی خبر پہنچتے ہی گلگت میں تعینات میجر رابرٹسن چترال روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کرتے ہیں[5]۔ 2 گورکھا کے سربراہ کیپٹن ٹاون شینڈ (Captian Townshend) اور لیفٹیننٹ گاؤف (Lieutenant Gough) گوپس سے 4 کشمیر انفنٹری کے دو سو پچاس بندے لے کر چترال کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور غذر میں کیپٹن والٹیر کیمبیل (CaptianWalterCampbell)

---

[3] Author of 'Chitral; the story of a minor siege

[4] The Siege of Chitral and the "Breach of Faith Controversy" - The Imperial Factor in Late Victorian Party Politics by Robert Huttenback

[5] With Kelly to Chitral by W G L Beynon

اور سرجن کیپٹن وٹچرچ(Surgon Captian Whitchurch)ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب ایک ساتھ درہ درۂ شندور پار کرکے مستوج سے 14 سکھ رجمنٹ کے باقی ماندہ سپاہیوں اور ان کے سربراہ لیفٹیننٹ ہارلی(Lieutenant Harley) کو اپنے ساتھ شامل کرکے 31 جنوری کو چترال میں گورڈن کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ گلگت سے لیفٹیننٹ موبرلی(Moberly)14 سکھ ریجمنٹ کے ایک دستے کے ساتھ مستوج پہنچ کر ہارلی کی جگہ سنبھالتا ہے۔ گلگت کے پولیٹیکل ایجنٹ میجر رابرٹسن نے گلگت سے عمرا خان کو ایسی کوئی حرکت نہ کرنے کی تنبیہ کرکے خط لکھا، مگر تیر کماں سے نکل چکا تھا۔ نتیجتاً جنوب سے عمرا خان چترال کی طرف روانہ ہوئے تو شمال سے میجر رابرٹسن بھی چترال مارچ کیا[6]۔ چترال کی زبانی روایات کے مطابق عمرا خان، شیر افضل اور مہتر امیر الملک ایک ہی مقصد کے لیے تگ ودو کر رہے تھے اور وہ تھا شیر افضل کے پہنچنے پر عنانِ اقتدار ان کے حوالے کرنا۔

رابرٹسن ان حالات کی وجہ سے گلگت سے یکم فروری کو چترال پہنچتا ہے اور ۹ فروری کو پتہ چلتا ہے کہ شیر افضل اور عمرا خان نے مل کر چترال کے جنوبی قصبے دروش میں واقع قلعہ پر قبضہ کیا ہے۔ میجر رابرٹسن ریاست چترال کے تخت سے امیر الملک کو ہٹا کر امان الملک کے چھوٹے فرزند شجاع الملک کو مہترِ چترال قرار دے دیتا ہے جس کی عمر اُس وقت صرف 12 سال تھی۔

اس دوران شیر افضل اور عمرا خان کی فوجوں کو چترال شہر پہنچنے سے روکنے کے لیے گہریت کے مقام پر اُن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے مگر وہاں سے ناکامی کے بعد 3 مارچ کو چترال شہر میں فرنگیوں اور شیر افضل و عمرا خان کی فوجوں کے درمیان شدید جنگ چھڑ جاتی ہے۔ بہر حال 3 مارچ کی جنگ انگریزوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ انگریزی فوج میں شامل کشمیری اور گورکھا سپاہیوں کو بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا اور شام تک میدانِ جنگ سے ان کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ایک فرنگی کیپٹن جون بیرڈ[7](John McDonald Baird) زخمی ہو کر اگلے دن مر جاتا ہے جبکہ دوسرا کیپٹن کیمپبل (Walter Campbell) زخمی ہوتا ہے۔

میدانِ جنگ سے بھاگ کر انگریزی فوج قلعہ چترال کے اندر محصور ہوتی ہے۔ یہ واقعہ تاریخ میں "محاصرہ چترال" کے نام سے مشہور ہے۔ انگریز حکام، فوجی اور نو منتخب مہترِ چترال شجاع الملک 3 مارچ سے 18 اپریل تک قلعے میں محصور رہتے ہیں جبکہ باہر شیر افضل اور عمرا خان کے سپاہی دندناتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ گلگت سے مستوج پہنچ کر رابرٹسن کے حالات کے بارے میں پتہ چلنے کے بعد 2 بمبئی انفنٹری کے لیفٹیننٹ ایڈورڈز Lieutenant (Edwardes) اور بنگال سیپرز کے لیفٹیننٹ فولر(Lieutenant R E Folwer) کو چند سپاہیوں کے ساتھ چترال آتے ہوئے۔ ریشن

[6] With Kelly to Chitral by W G L Beynon

[7] کیپٹن بیرڈ کو پہلے ہنزہ سے ٹاونشینڈ کی جگہ سنبھالنے گوپس بلایا گیا اور پھر گوپس کی کمان اسٹیوارٹ کو دیکر انہیں بھی رابرٹسن کے پاس چترال بھیجا گیا تھا۔

کے مقام پر شیر افضل کے حامی پولو میچ کھیلنے کے بہانے دعوت دے کر قید کرتے ہیں جبکہ انہیں چھڑانے کے لیے آنے والے کپتان روز (Captain Ross)اور اُن کے 43 سپاہی، کوراغ اور زیئت کے درمیان ایک تنگ گھاٹی "کڑاک" میں دشمن کے ہاتھوں لقمہ اجل بن جاتے ہیں[8]۔

قلعے میں محصور فرنگیوں سمیت 550 کے قریب سکھ اور گورکھا فوجیوں کی نظر بندی اور ارد گرد فرنگیوں پر بے تحاشا حملوں کی خبر پہنچتے ہی انگریزی سرکار حرکت میں آجاتی ہے اور ۲۲ مارچ کو یعنی محاصرے کے ۱۸/۹ دن بعد گلگت میں موجود انگریزی فوج کے سربراہ لیفٹنٹ کرنل جیمز کیلی (James Kelly)فوج لے کر براستہِ شندور چترال کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ سال کے اس حصے میں 12 ہزار فٹ سے زیادہ اونچے اور برف سے ڈھکے دشوار گزار شندور پاس کو پار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ چترال کا جغرافیہ فوجی نقل و حمل کے لیے نہایت غیر موزوں ہے۔ ساتھ اجنبی علاقہ اور مقامی آبادی کی ممکنہ مخاصمت کا خطرہ اس مہم کو اور بھی مشکل بنا دیتا تھا۔ یہ کتاب مذکورہ مہم میں کرنل کیلی کی ریلیف فوج کے اسٹاف افسر لیفٹیننٹ ڈبلیو جی ایل بینین(William George Lawrence Beynon) کی یاداشتوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک پُر خطر مہم پر نکلے ایک سپاہی کی سر گزشت اور مہم میں پیش آنے والے واقعات، اس میں حصہ لینے والے کرداروں، خون ریز معرکوں، اور تلخ تجربوں کے ساتھ ساتھ چند شگفتہ لمحات کی داستان ہی نہیں بلکہ سلطنتِ انگلشیہ اور روس جیسی بڑی عالمی طاقتوں کے مابین گریٹ گیم کے نتیجے میں چترال کی ایک چھوٹی اور آزاد ریاست میں انگریزوں کی پہلی براہِ راست مداخلت کی کہانی بھی ہے۔ چترال کی تاریخ کا یہ باب اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے چترال کے بعد کی سیاسی اور انتظامی حیثیت پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ساتھ ہی یہ کتاب آج سے تقریباً سوا صدی قبل کے چترال کی ایک زندہ اور متحرک تصویر بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار لندن سے 1896ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ کیا گیا جو اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

نور شمس الدین

نذر بائیوف یونیورسٹی، استانہ، قازقستان

22 اپریل 2022ء

---

[8] Chitral; The Story of a Minor Siege by GS Robertson

مصنف کا والدہ کو ایک خط

گلگت

21اکتوبر1895

پیاری والدہ!

اس سے پہلے کہ آپ چند ہفتوں کی یہ مختصر کہانی پڑھیں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کسی مہم جوئی کی داستان ہے نہ بہادرانہ کارناموں کی کتھا بلکہ سرحدی مہمات پر مامور انگریز افسروں اور ہندوستانی سپاہیوں کے گزرے شب و روز کی عام سی روداد ہے۔

یہ کہانی ہے ان حالات کی جن میں ہم جی رہے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے کی، چند خوشیوں سے بھرپور لطیفوں کی اور چند مشکلات کی۔ یہ ان حالات کی کہانی ہے جب ہم کبھی برف چیرتے ہوئے اور کبھی بارشوں میں بھیگ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ اس دوران ہم کبھی تپتے صحراؤں سے گزرے تو کبھی سرسبز میدانوں سے۔ مختصر یہ کہ اس میں مہم کے دوران ہم پر بیتتے ہر لمحے کی کہانی رقم ہے۔

پیاری والدہ! یہ سب میں صرف آپ کے لیے لکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ آپ کو خوش کرنے کا سبب بنے۔

فقط

آپ کا بیٹا ڈبلیو۔بی

بابِ اول
تعارف

"کیا آپ گلگت جانا پسند کریں گے؟"

یہ سوال مجھ سے اس وقت پوچھا گیا جب میں شملہ کے عسکری دفاتر میں ایک کتاب اور چند نقشہ جات کی تلاش میں سرگردان تھا۔ اس سے پہلے کبھی گلگت کا خیال تک میرے ذہن میں نہیں آیا تھا اور اس سوال نما حکم کے ساتھ ہی میں افسوس کرنے لگا کہ میں نے وقت سے پہلے وہاں رہائش گاہ کی درخواست کیوں نہیں دی تھی۔

یہ جون 1894 کے اواخر کی بات تھی اور 24 اگست کو میں درہِ برزل سے گزر کر ضلع گلگت میں داخل ہو رہا تھا۔ 31 اگست کی صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی میں وادیِ سندھ کی سرزمین میں نیچے دائین سے رام گھاٹ آ چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ میں اچانک دانتے کے جہنم میں آ گیا ہوں۔ جھولنے والے پُل پر آتے ہی میں نے دانتے کا فقرہ 'یہاں داخل ہونے پر تمام امیدیں ختم ہو جاتی ہیں' ڈھونڈنے لگا جو کہ ملنے والا نہیں تھا۔ البتہ پل کی حفاظت پر مامور گارڈ مل گئے جنہوں نے بتایا کہ یہاں اور جہنم کے موسم میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ یہاں کے باسی تھے اور ان کی معلومات معتبر تھیں۔ اب زمین پر ہونے کا یقین ہونے کے بعد میرے لیے ان کی طرف سے پیش کردہ چائے کے پیالے کو مسترد کرنا ممکن نہ رہا تھا۔

دو گھنٹے بعد میں بونجی پہنچ چکا تھا جہاں مجھے پتہ چلا کہ مجھے یہاں رہنا تھا۔ میری آمد کے دو دن بعد کشمیر جانے والا ایک نوجوان افسر ملا جو میرے گلگت آنے پر حیران تھا اور پہلا سوال ہی یہ پوچھا کہ میں گلگت کیوں آیا ہوں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ "گلگت میں رکھا کیا ہے؟" چونکہ میری روانگی سے اب تک یہی سوال کئی بار پوچھا گیا تھا اس لیے بتاتا چلوں کہ گلگت آنے کی دو دفتری وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ میرا فوجی ہونا تھا اور دوسری انٹیلجنس برانچ کی طرف سے دی گئی ذمہ داریاں تھیں۔ یہ کاغذی وجوہات تھیں لیکن حقیقی وجہ ان سرحدات پر متوقع جنگ کے منڈلاتے خطرات تھے۔ شملہ میں اسے عسکری مہم کا نام دیا جا رہا تھا۔ کشمیر واپس جانے والے نوجوان افیسر کے گلگت آنے سے متعلق سوال کا تعلق بھی اس حصے سے تھا لیکن اس کے مطابق جنگ کی گنجائش موجود نہیں تھی۔ اپنی اسی خوش گمانی کی وجہ سے وہ دوسرے علاقے کی طرف جا رہا تھا اور میری (سرحدی علاقوں میں) آمد پر حیران تھا۔ پہلے پہل تو اس کے مفروضات ٹھیک ثابت ہو رہے تھے کہ وہ دو مہینوں کے اندر وزیرستان کے محاذ پر لڑ رہا تھا اور میں یہاں بونجی میں محض روٹیاں توڑ رہا تھا۔ مگر پھر اچانک میری قسمت بدل گئی اور میں اپنی نادانی پر ہنسنے لگا۔

بہر حال بطور انٹیلجنس برانچ ممبر میری گلگت آنے کی دوسری وجہ چترال کے بارے میں معلومات لینا تھی۔ بونجی میں دو مہینے سے زیادہ بے کار پڑے رہنے کے بعد مجھے اوائل نومبر میں سروے کے لیے چترال جانے کا حکم ملا۔ چترال میں کام دس دنوں کے اندر نمٹا کر میں یکم دسمبر کو واپس گلگت کے لیے روانہ ہو گیا اور ۹ دسمبر کو یہاں پہنچا۔ میں نے چترال کے حوالے سے کچھ معلومات اکٹھی کی تھیں جو بعد میں میرے بہت کام آنے والی تھیں۔ بہر حال کرسمس گلگت میں منا کر 2 جنوری 1895 کو میں ہنزہ کی طرف نکل گیا جہاں میں نے باقی سردیاں گزارنی تھیں۔

7 جنوری کو مہترِ چترال نظام الملک کے قتل کی خبر گلگت پہنچی اور گلگت میں مقیم پولیٹیکل ایجنٹ ڈاکٹر رابرٹسن (Dr. Robertson) نے دورہِ چترال کی تیاریاں شروع کیں۔ کیپٹن ٹاون شینڈ (Captain Townshend) جو 2 گورکھا کے لیفٹیننٹ گاؤف (Lieutenant Gough) کے ساتھ گوپس میں مقیم تھا کو کشمیر انفنٹری کے 250 رائفل برداروں کے ساتھ چترال کی طرف روانگی کا حکم ملا۔ پہلا دستہ لیفٹیننٹ گاؤف جبکہ دوسرا کیپٹن ٹاونشینڈ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ انگریز ایجنٹ کیپٹن کیمبل (Captain Campbell) اور سرجن کیپٹن وٹچرچ (Captain Whitchurch) غذر میں دوسری پارٹی سے ملے اور سب نے ایک ساتھ درہِ شندور پار کیا۔ مستوج کے مقام پر انہوں نے لیفٹیننٹ ہارلی (Lieutentant Harley) کی قیادت میں موجود 14 سکھ رجمنٹ کے باقی ماندہ سپاہیوں کو اپنے ساتھ شامل کیا جو پیچھے چترال میں گورڈن (Gurdon) کے پاس نہیں گئے تھے۔ یہ سب 31 جنوری کو مل کر چترال پہنچے۔ لیفٹیننٹ موبرلی (Lieutenatnt Moberly) 4th کشمیر انفنٹری کے ایک دستے کے ساتھ گلگت سے مستوج گئے اور وہاں کی کمان سنبھال لی۔ گاؤف واپس غذر آئے اور ان کی جگہ کیپٹن بیرڈ (Captain Baird) نے گوپس کی کمان سنبھالی جو 6th کشمیر انفنٹری کے ماتحت تھا۔ مجھے ہنزہ سے بلایا گیا اور میں بطور اسٹاف افیسر بیرڈ کے مکان پر قابض ہو گیا۔ جلدی لیفٹیننٹ فولر (Lieutenant Fowler) کو بنگال سیپرز کے دستے کے ہمراہ ساتھ چترال پہنچنے کا حکم ملا اور 2nd بمبئی انفنٹری کے لیفٹیننٹ ایڈورڈز (Lieutenant Edwardes) کو ہنزہ نگر لیویز کی قیادت سنبھالنے کو کہا گیا۔ ہنزہ نگر لیویز پہلے ہی ہنزہ سے گلگت کے لیے نکل چکے تھے۔ اگلا حکم کیپٹن بیرڈ کو چترال پہنچنے اور کیپٹن اسٹیوارٹ (Stewart) کو اس کی جگہ گوپس کی قیادت سنبھالنے کا ملا۔

21 فروری کو روز اور جونز 14th سکھ ریجمنٹ کی کمک کے ساتھ گلگت سے براستہ مستوج عازمِ چترال ہوئے۔ ہنزہ اور نگر لیویز 7 مارچ کو گلگت آئے اور دوسرے دن میں نے ہر ایک کو سینائڈر کاربینز اور 20 راونڈ کارتوس دے کر چترال کی طرف بھیج دیا۔ لیویز کے یہ سپاہی شاندار لوگ تھے، بہادر، جنگو، پہاڑوں سے واقف، نہ تھکنے والے۔ ہر ایک کو سرخ پٹی بطور نشانی دی گئی تھی جو انہوں نے اپنی ٹوپیوں کے ساتھ باندھی تھیں۔ لیکن بعد میں چترال میں پیش آنے والے معرکہِ نصر گول کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ یہ لیویز بہادر ہونے کے باوجود ناکافی تھے۔

چونکہ چترال سے خبریں آنا بند ہوئی تھیں اس لیے گلگت کے اسسٹنٹ برٹش ایجنٹ نے 32 پائینرز جو چلاس روڈ پر کام کر رہے تھے، کو گلگت بلانے کی تیاری کرنے لگا کہ بوقتِ ضرورت انہیں ایڈوانس پارٹی کے طور پر چترال روانہ کیا جائے۔ اس نتیجے میں 20 مارچ کو کرنل کیلی دو سو آدمیوں کے ہمراہ گلگت پہنچے اور دوسرے دن کیپٹن بورڈیل (Captain Borradaile) نے بھی اتنی ہی تعداد کے ساتھ گلگت رپورٹ کی۔

21 مارچ کو مستوج سے خبر پہنچی کہ کیپٹن روز کے 14^{th} سکھ رجمنٹ پر حملہ ہوا ہے۔ اس حملے میں روز اور 46 فوجی مارے گئے۔ لیفٹیننٹ جونز اور 14 آدمی بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے باوجود اس کے کہ جونز اور 9 سپاہی شدید زخمی تھے۔ ایڈورڈز اور فولر کی تاہم کوئی خبر نہیں تھی۔ اس خبر نے تہلکہ مچادیا اور ٹیلی گرام دھڑا دھڑ آنے جانے لگے۔ آخر کار کرنل کیلی کو گلگت کی پوری فوج کی قیادت دی گئی۔ کیلی کو سربراہ بنانے کی خبر 22 مارچ کو گلگت پہنچی جبکہ اس سے ایک دن پہلے کیلی نے مجھے اسٹاف افسر بننے کی پیش کش کی تھی جو کہ میں بخوشی قبول کر چکا تھا۔

یہاں میں فوجی تعداد کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہم کرنل کیلی کی قیادت میں دو دستوں کی شکل میں گلگت سے روانہ ہوئے۔ پہلے دستے میں ہمارے پاس 32^{nd} پائینرز کے چار سو جوان تھے جن کی قیادت کپٹین بورڈیل کے ہاتھ میں تھی۔ ان دو کے علاوہ ہم سب کیپٹن کے رینک سے نیچے کے افسر تھے۔ ہم میں سب سے سینئر پیٹرسن تھے جو دوسرے دستے کی قیادت کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایجوٹنٹ لیفٹیننٹ بیتھون (Lieutenant Bethune)، سرجن کیپٹن براؤننگ اسمتھ (Surgon Captain Browning Smith) اور لیفٹیننٹ کاب (Lieutentant Cobbe) تھے۔ کیپٹن دے ویسمز (Captain de Vismes) کو گو پس آکر کیپٹن اسٹیوارٹ کی جگہ سنبھالنی تھی جنھیں کشمیر ماونٹین بیٹری کو دو توپوں سمیت چترال پہنچانے کی بھاری ذمہ داری مل چکی تھی۔ اسٹیورات کا تعلق آئرلینڈ سے تھا اور ان جیسا خون کا پیاسا شخص میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ روزانہ بس یہی شکایت کرتا تھا کہ چترالی مقابلے پر کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ اس کے بعد سرجن کیپٹن لیوارڈ (Surgon Captain Luard) تھا۔ یہ سب وہی تھے جو گلگت سے نکلے تھے۔ باقی راستے میں شامل ہونے والوں کا تعارف میں وقتاً فوقتاً کرتا رہوں گا۔

بابِ دوم
منزل کی جانب

22مارچ کو کرنل کیلی نے ذمہ داریاں سنبھال لیں اور دوسری صبح 200افراد پر مشتمل ایڈوانس پارٹی کیپٹن بورڈیل کی قیادت میں روانہ ہوئی۔ مقامی گزیٹیر کے مطابق سال کے ان دنوں گلگت میں کبھی بارش نہیں ہوتی تھی مگر 23مارچ کی صبح ہی بارش شروع ہوئی جو دو دن تک جاری رہی۔ ہمارے پاس خیمے تک نہیں تھے اس لیے بارش سے بچنے کے لیے پڑاؤ (بمقام شروٹ) کی پہلی رات جوانوں کو اپنی برساتیاں جوڑ کر سر چھپانے کی جگہ بنانی پڑی۔ کرنل کیلی، سرجن لوارڈ اور میں دو بجے گلگت سے نکلے۔ ہمارا ارادہ صبح نو بجے نکلے ہوئے دستے کے پاس پہنچنا تھا۔ لوارڈ کے پاس وحشی قسم کا ایک عمومی قد سے چھوٹا گھوڑا تھا جس کی لگام میں جبڑوں کو کنٹرول کرنے کے لیے زنجیر تک نہیں تھی۔ اور یوں یہ ہمارے لمبے سفر کے لیے دردِ سر سے کم نہیں تھا۔ میں نے لوارڈ پر زور ڈال کر اسے آزاد کروانے کی کوشش کی۔ اور آخر کار اس وعدے پر کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوا تو میں اس کی باقیات کو دفنا دونگا، لوارڈ گھوڑے کو کھولنے پر راضی ہو گیا۔ لگام کُھلتے ہی گھوڑا ہوا میں گرد غبار چھوڑتا ہوا غائب ہوا۔ وہ اگلے کیمپ میں ہمارے پہنچنے سے پہلے موجود تھا!

جوان پہلے ہی سے پڑاؤ پر موجود تھے اور سخت بارش کے باوجود پُر سکون تھے۔ کیلی کے پاس ایک چھوٹا سا خیمہ تھا جبکہ ہمیں مویشیوں کے باڑے میں سونے کی عیاشی میسر آئی۔ ہم زیادہ سامان جیسا کہ بستر، بڑے بڑے کوٹ اور کئی جوڑے کپڑوں کی جھنجھٹ سے آزاد تھے۔ جوانوں نے اونی کوٹ اوڑھے ہوئے تھے اور ہر کوئی اپنے جوتوں کے حوالے سے خوش تھا۔ ہم میں سے زیادہ تر نے مقامی جوتے پہنے تھے جن کے نیچے چمڑے کی جرابیں تھیں۔ مقامی طور پر تیارہ کردہ یہ پہناوے برفانی راستوں کے لیے اس وجہ سے بھی زیادہ مناسب تھے کہ آپ چاہیں جتنی جوڑی جرابیں پہن لیں آپ کے جسم میں خون کی گردش پر کوئی فرق پڑے گا نہ جوتے چھوٹے پڑیں گے۔ افیسروں اور تمام جوانوں کو چشمے مہیا کیے گئے تھے جو کہ ان حالات میں بہت ضروری تھے۔

ہمارے کھانے کا انتظام کرنے والے انتہائی نفیس اور ہنس مکھ تھے۔ فوج اتنی چھوٹی تھی کہ اکثر 32nd پائنرز دوسرے افسروں کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دیتے۔ ہر بندے کو الگ چھری، چمچ، کانٹا اور پلیٹ دی جاتی اور تمام اشیا ایک ساتھ سنبھالی جاتی تھیں۔ سفری دستور کے مطابق روانگی کا وقت سات بجے ہوتا تھا۔ ہم نے روانگی (24مارچ) سے قبل ناشتہ کیا۔ ہم سے آگے جانے والوں کے پاس سور کے بھنے ہوئے گوشت اور بہترین انڈے تھے۔ سور کے گوشت کی خوبی یہ ہے کہ یہ آپ کو تھکے بنا سارا دن سفر کروا سکتا ہے۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ کس طرح سور کے بھنے ہوئے گوشت ختم ہونے کے اعلان نے پوری کیمپ میں مایوسی پھیلا دی تھی۔ تاہم بکری کا گوشت کبھی ختم نہیں ہوا۔ ایک غریب کے سہارے کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا۔

قاعدے کے مطابق دوپہر میں ہم چند ساعتوں کے لیے رُکتے۔ چائے پیتے، چپاتی کھاتے۔ شراب چونکہ نایاب تھی اس لیے رات کے کھانے کے وقت ہی مل جاتی۔ کھانا عموماً شام ہوتے ہی کھا لیتے۔ بعض اوقات ہمیں رات گئے خیموں تک جانے کی وجہ سے کھانا اور چائے ایک ہی وقت مل جاتی جس کا ہم نے کبھی برا نہیں منایا کیونکہ معروضی حالات میں کھانے کی کسی چیز کا ملنا اہم ہوتا ہے نہ کہ کھانے پینے کی ترتیب اور آداب۔ میس میں صرف کچھ سفری میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ہم سب اپنی ایک سفری کرسی اٹھالاتے یوں ہم عیاشیاں کررہے ہوتے تھے۔ کھانے کے بعد تمبا کو پھونکے جاتے اور پھر ہم سونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ہم گھاس پھونس بچھا کر سوجاتے اور اگر وہ بھی نہ ملتی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ نہ ہی یہ ہمارے لیے کوئی انہونی بات ہوتی کیونکہ ہم سب نوجوان تھے اور عام دنوں میں بھی اکثر اوپر پہاڑوں میں برف کی آغوش میں سویا کرتے تھے۔ ہاں اگر بارش ہوتی یا سردی زیادہ ہوتی تو ہم جھونپڑیوں کا رخ کیا کرتے تھے۔ یہ کوئی معمولی جھونپڑیاں نہیں ہوتیں بلکہ انہیں تعمیر کرنے کے لیے مضبوط پتھروں کی دیوار پر دیو قامت شہتیر ڈالے جاتے اور پھر اوپر مٹی ڈال کر بند کیا جاتا۔ عموماً ہر گھر کے درمیان کھانا پکانے کی انگھیٹی بنائی جاتی اور اوپر ایک سوراخ ہوتا جو بظاہر دھواں باہر نکالنے کے لیے بنایا جاتا مگر ہم نے ہر جگہ محسوس کیا کہ دھواں اس سوراخ کی طرف جانے کی بجائے گھر کے اندر ہی گھومتا رہتا تھا۔

ان گھروں میں ایک اور بظاہر چھوٹا مسئلہ بھی تھا۔ وہ یہ کہ اس رہائش گاہ میں بھیڑ بکریوں کی آپ کے ساتھ موجودگی پر آپ کے اعتراض کو مال مویشی اپنے ذاتی معاملات میں آپ کی طرف سے بے جا مداخلت سمجھتے تھے ان گھروں میں عموماً بھیڑ بکریاں بھی رکھی جاتی تھیں۔ یہ جانور چونکہ بڑی جسامت کے تھے لہٰذا انہیں ان کی مرضی کے خلاف بھی پکڑ کر باہر نکالا جا سکتا تھا مگر وائے افسوس کہ کچھ نہایت ہی چھوٹی جسامت کی نظر نہ آنے والی کسی مخلوق بلکہ فوج کو ہماری آمد سے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ وہ ہمارے جسموں سے لگی رہتیں۔ ان ہی کی وجہ سے موسم بہتر ہوتے ہی ہم باہر سونے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

یہاں سے ہم پُنیال ضلع میں سِنگُل نامی ایک گاؤں پہنچے۔ اس گاؤں کے خوش مزاج حکمران راجہ اکبر خان جو دریا کے اُس پار ایک قلعے میں رہتے تھے، نے رسیوں سے بنے ایک اونچے اور لمبے پل سے گزر کر راستے میں ہمارا استقبال کیا۔ یہ پل شاید اس علاقے میں سب لمبا اور اونچا پل تھا۔ راجہ صاحب چھوٹے قد کے ہونے کے باوجود پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ چونکہ موصوف کے خاندان کے کئی افراد میجر رابرٹسن کے ساتھ چترال کے قلعے میں نظر بند تھے اس لیے انہوں نے چترال مہم میں اپنے ساتھیوں سمیت شامل ہونے کی پیش کش کی جسے کرنل کیلی نے قبول کیا۔ بوڑھے راجہ خوش ہو کر اسباب سفر باندھنے اپنے قلعے کی طرف چلے گئے۔ سِنگُل میں ہم تمام جوانوں کو مکان مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو دو دنوں سے مسلسل بارش کی وجہ سے بھیگ چکے تھے۔

اگلے دن (25 مارچ) خوش قسمتی سے بارش رک گئی تھی اور دوپہر تک دھوپ نکلنے کی وجہ سے ہر کوئی خوش تھا۔ اس دن ہم گاہکوچ میں رکنے کی بجائے عام دنوں سے دوگنا فاصلہ طے کر کے ہوپر پڑی[9] تک چلے جہاں دریا کے کنارے اونچے پہاڑوں کے دامن میں ایک خوفناک جگہ پر خیمے نصب کیے گئے۔ قریب کوئی گاؤں نہیں تھا۔ یہ ایک غیر آباد اور تنگ جگہ تھی اور ہوا چلتے ہی ایسا لگتا کہ گویا ہم ایک خشک پائپ کے اندر رہوں۔

(26 مارچ کو) ہوپر سے ہم گوپس روانہ ہوئے۔ گوپس قلعہ گزشتہ سال ہی کشمیری فوج نے نہایت ہی سائنسی بنیادوں پر بنایا تھا۔ تاہم ایک نقص اس میں یہ تھا کہ اس پر ہر طرف سے حملہ آور ہوا جا سکتا تھا اور صرف چار آدمی لمبے فاصلے تک مار کرنے والی بندوق سے حملہ کر کے ہی باآسانی اندر گھس سکتے تھے۔ یہاں ہم کیپٹن اسٹیوارٹ سے ملے جو اپنی پسندیدہ توپوں کے متوقع استعمال پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ انہوں نے نشانہ اور فاصلہ دیکھنے کے واسطے قریبی گاؤں پر چند گولے داغنے کی خواہش کا اظہار تک کر دیا تاہم اس کی اس تجویز کو رد کیا گیا۔ گوپس میں ہم نے آفیسرز کوارٹر کے اسٹور پر چھاپہ مارا اور کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ نتیجے میں اسٹور کے نگران کیپٹن دے ویسمز، جو ہمارے ساتھ ہی آئے تھے کو گلگت سے اپنے لیے نیا بندوبست کرنا پڑا۔ اس رات ہمیں بہترین کھانا ملا جو شاید اسٹیوارٹ کی طرف سے تھا۔ وہ وقفے وقفے سے اٹھ کر اس بات پر خوشی سے ناچ رہا تھا کہ کل وہ اپنی توپوں کو دیکھ سکے گا جو کہ پیٹرسن کی قیادت میں آنے والے دوسرے گروپ کے پاس تھیں۔ گوپس سے میں نے اپنا گھوڑا واپس جھجھ دیا کیونکہ ہمیں شک تھا کہ ہم ان جانوروں کے ساتھ درہِ شندور کراس نہیں کر سکتے۔ یہ خیال بعد میں ٹھیک ثابت ہوا۔

(27 مارچ) گوپس سے آگے ہم ان علاقوں کے مخصوص پہاڑی راستوں پر چلنے لگے جہاں صرف مقامی گھوڑے ہی چل سکتے تھے تاہم ایسے راستوں پر کسی بھی قسم کے گھوڑوں کا مالک ہونا کوئی قابل فخر بات نہیں تھی۔ یہاں سے ہم نے سرکاری خچر واپس کیے اور مقامی قُلی لے لیے۔ گوپس سے داہمیڑ کا فاصلہ نہ صرف لمبا تھا بلکہ راستے میں بے تحاشا نشیب و فراز بھی آئے۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری فوج کے آخری دستے کا سربراہ لیفٹیننٹ کاب رات گئے ہم تک پہنچ سکا۔

داہمیڑ گاؤں دریا کی دوسری طرف ہے۔ لہٰذا ہم وہاں نہیں گئے بلکہ دریا کی دائیں طرف ہی چھوٹی موٹی جھاڑیوں کے بیچ خیمہ زن ہوئے جہاں سے ہمیں جلانے کے لیے لکڑیاں مل سکتی تھیں۔ آگے چلنے والوں نے چار مرغابیاں خریدی ہوئی تھیں جو کیچن کے لوازمات کے ساتھ ایک ٹوکرے میں رہتیں۔ ہمارے کچن کا سربراہ برونگ سمتھ ان مرغابیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جیسے ہی مرغابیوں کو ٹوکرے سے نکالا جاتا سمتھ انہیں بلاتا اور وہ کسی مناسب تالاب کی تلاش میں ان کے پیچھے خراماں خراماں چلنے لگتیں۔ مجھے نہیں پتہ انہیں کب کھایا گیا۔ مجھے کم از کم غذر میں انہیں کھانا یاد نہیں آتا اور ساتھ اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ درہِ شندور کے پار نہیں پہنچیں۔

---

[9] پڑی غذر میں پہاڑی پر بنے مشکل راستے کے لیے مستعمل لفظ ہے۔ ہوپر کے مقام پر پہاڑی کے درمیان سے پتھر کی دیواروں کے ذریعے مشکل راستہ بنا ہوا تھا جسے ہوپر پڑی کہتے تھے۔

ہمارا اگلا پڑاؤ (28 مارچ) پنگل تھا جو صرف نو میل کے فاصلے پر تھا۔ پنگل میں ہماری ملاقات مہربان شاہ سے ہوئی جو کہ اس علاقے کے بالائی حصے کا حاکم یا گورنر تھا۔ مہربان شاہ مرحوم نظام الملک کے تیارہ کردہ قاتلوں کے گینگ کے سربراہ تھے۔ ایسے ہی کسی ایک واقعے پر مہربان شاہ فخر کیا کرتے تھے کہ کس طرح نہایت نفاست اور عمدگی سے اس نے کام کو انجام دیا تھا۔ میں واقعے کی تفصیلات تو بھول گیا ہوں تاہم اتنا یاد ہے کہ اس واقعے میں پانچ بندے مارے گئے تھے۔ سہ پہر کی چائے پر جہاں شاہ مرزا ترجمانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میری مہربان شاہ سے لمبی گفتگو ہوئی جو چترال میں موجود مختلف گروہوں کے بارے میں ضروری اور غیر ضروری تفصیلات سمجھنے میں معاون ثابت ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ اسی نشست کی بدولت مجھے چترال میں قلعہ دراسن کی اہمیت اور وہاں تک جانے والے راستے کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا۔ یہ معلومات اتنی اہم تھیں کہ بلا توقف اسی رات کرنل کیلی کے گوش گزار کی گئیں۔ نتیجتاً اسی وقت یہ فیصلہ ہوا کہ ہم عمومی راستے سے بونی جانے کے بجائے قلعہ دراسن سے ہو کر جائیں گے۔

مجھے نہیں لگتا کہ میں نے شاہ مرزا کا پہلے کہیں ذکر کیا ہو لہٰذا یہ مناسب ہے کہ اب ان کا تعارف کیا جائے کیونکہ وہ ہمارے نہایت اہم رفقاء میں سے ایک ہیں بلکہ اب تو میرے عزیز ترین دوست بھی ہیں۔ شاہ مرزا "سائی" اور "گور" کے وزیر یا گورنر ہیں۔ آپ داموت کے رہنے والے ہیں جو بونجی کی دوسری طرف سائی کا ایک گاؤں ہے۔ میری اور ان کی پہلی ملاقات میری بونجی میں رہائش کے دوران ہوئی تھی۔ ان کی کہانی بڑی دلچسپ ہے اور کئی مہمات کے علاوہ انہوں نے پامیر اور چترال کا خفیہ دورہ بھی کیا ہوا ہے۔ وہ ہمارا سب سے اہم ترجمان تھا۔ وہ اور ان کے پانچ بندوں میں سے ایک ہمیشہ ہمارے قریب رہتے تھے۔ اس کے تمام رفقاء لیویز کے تھے اور ان میں سے ایک پہلے میری شکاری مہموں میں میرا ملازم ہوا کرتا تھا جو لیویز میں بھرتی ہونے کے بعد شکار کرنا چھوڑ دیا۔

اس علاقے کی روایات کے مطابق کسی ضلع کے سربراہ کے لیے لازم ہے کہ وہ آنے والے صاحب (فرنگی) کو خوش آمدید کہے اور بدلے میں علاقے کی روایات کے مطابق صاحب نے انہیں چائے میٹھے گوشت کے ساتھ پیش کرنی ہوتی ہے۔ ایسی ملاقاتوں کے لیے بسکٹ بھی نہایت کارآمد ہے کیونکہ وہ میٹھا بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس دوران وہ آپ کی بے جا تعریف کریں گے اور آپ کو اپنے ماں باپ تک کا درجہ دیں گے اور جواباً آپ بھی کہہ دیں گے کہ جو چیز آپ کی ہے وہ ان کی ہے۔ اگر انہیں کوئی شکایت یا مطالبہ ہو جو کہ عموماً ہوتا ہے تو وہ دورانِ گفتگو انتہائی چالاکی سے پیش کریں گے جس کے لیے صاحب کو ہر دم تیار رہنا چاہیے۔ جب آپ اس قسم کی واہیات سے اکتا جائیں گے تو آپ شائستہ طریقے سے کہہ دیں گے کہ شاید وہ تھک گئے ہیں اور انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ وہ بات سمجھ جائیں گے اور باقی ماندہ بسکٹس جیب میں ٹھونس کر چلے جائیں گے۔ ہم نے ایسی کئی ملاقاتیں دیکھیں جنہیں "سیاسی چائے" کا نام دیا جاتا تھا۔

مہربان شاہ ہمارے لیے کافی کارآمد ثابت ہوئے۔ میں غلط سمجھ رہا تھا کہ چونکہ اسے ادراک ہے کہ مخالفین کے ہاتھ لگنے کی صورت میں اس پر بالکل رحم نہیں کیا جائے گا لہٰذا وہ یہ سب ہمیں اپنے اور اپنے دشمنوں کے درمیان کھڑا کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ پنگل اور آگے ہمارے پڑاؤ چھشی (29 مارچ)

میں انہوں نے ہمارے چھوٹے دستے کے لیے گاؤں میں رہائش کا بندوبست کیا جس کے لیے یقیناً ہمارے سپاہی ان کے شکر گزار تھے کیونکہ اب ہم سطح سمندر سے کافی بلند تھے اور یہاں کی راتیں سرد تھیں۔ اگرچہ یہ ضلع ہمارے بھروسے کا تھا تاہم پھر بھی ہم نے پہرہ داروں اور گشتی ٹیم کے ساتھ ایک فرنگی افیسر کی ذمہ داری لگائی ہوئی تھی کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ نہ پیش آئے۔

بابِ سوئم

درۂ شندور

(۲۹ مارچ کو) پنگل سے نکلتے ہی علاقے کے خدوخال کافی حد تک بدلنے شروع ہوگئے۔ بار بار پہاڑی پر چڑھنے اور پھر دریا کے ساتھ اُترنے کے بجائے علاقہ اب وسیع اور ہموار ہوتا جارہا تھا۔ ہم وادیٔ غذر کے آخری سرے تک پہنچ رہے تھے۔ چھشی سے آگے خاصی چڑھائی کے بعد راستہ نیچے اترنے لگا اور ہم پھنڈر جھیل کے پہلو میں اتر گئے۔ یہ جھیل 1894 کے اوائل میں ساڑھے چار میل تک پھیلا ہوا تھا۔ تاہم اسی سال جولائی میں جھیل کے آخری سرے میں پانی اپنے لیے راستہ بنانے میں کامیاب ہوا اور اس نکاس سے خاصا پانی بہہ گیا۔ آخری بار نومبر میں جب میں یہاں سے گزر رہا تھا تو جھیل کے آس پاس کی زمین پر جابجا لمبی اور گہری دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ اب یہ دراڑیں برف پڑنے کی وجہ سے بند ہو چکی تھیں جبکہ دریا کا پانی گدلا اور گہرا ہو چکا تھا۔

اب ہم برفیلی زمین پر پہنچ چکے تھے اور ہمارے سبز چشمے کام آنے لگے تھے۔ ہمارے قدموں تلے برف پگھل کر مٹی کے ساتھ مل کر پھسلن بن چکی تھی اور چلنا تھکا دینے والا عمل بن گیا تھا۔ تاہم ہم (30 مارچ) دوپہر دو بجے غذر[10] پوسٹ پہنچ گئے جہاں سیکنڈ گورکھا کے سربراہ لیفٹیننٹ گاؤف نے ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے بتایا کہ غذر پوسٹ والوں کے پاس گزشتہ دس دنوں سے مستوج کی کوئی خبر نہیں پہنچی تھی حتیٰ کہ یہاں سے پیغام لے کر جانے والے قاصدوں میں سے بھی کوئی واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس بات سے ہم نے اندازہ لگایا کہ دشمن لاسپور اور مستوج کے درمیان کہیں موجود تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم پڑ گیا کہ دشمن سے سامنا درۂ شندور کے اُس پار اترتے ہی ہو سکتا تھا اور خوش قسمتی سے دشمن نے ہمیں ناامید نہیں کیا۔ غذر میں ہمیں اولڈھم (Oldham) بھی ملے جو انجینئرنگ کور کا ایک جونیئر افسر تھا اور ہم سے کچھ دن پہلے روانہ ہوا تھا۔ ان کے ساتھ کشمیر انجینئر کور کا ایک دستہ بھی تھا جو اب سنائڈر مشین گنوں سے مسلح ہو چکا تھا۔ یہ پوسٹ بکھرے ہوئے مکانات پر مشتمل تھی جنہیں خاردار تاریں لگا کر قلعہ بند کیا گیا تھا۔ یہاں فوجی چھاؤنی اتنی ہی بڑی تھی کہ پہلے سے یہاں پر موجود کشمیر رجمنٹ اس میں باآسانی سما سکتی تھی۔ ہمیں مجبوراً آس پاس کے گھروں میں گھسنا پڑا اور ایسے ہی ایک مکان کو ہم نے اپنے کھانا بنانے اور رہنے کے لیے منتخب کیا۔

30 مارچ کو ہم یہاں رُکے رہے تاکہ ہمارے بعد روانہ ہونے والا دستہ اور توپیں ہم تک پہنچ سکیں۔ کرنل کیلی چاہتے تھے کہ یہاں سے ہم ایک گروپ کی شکل میں ایک ساتھ آگے جائیں۔ یہاں سے ہم نے سو کے قریب ہنزہ اور نگر لیویز کے سپاہیوں کو بھی ساتھ شامل کیا جو اپنے لیڈروں کی ماتحت تھے۔ یہ

---

[10] غذر اب ایک ضلع کا نام ہے جو شندور سے شروع ہوکر ضلع گلگت تک پھیلا ہوا ہے۔ پرانے وقتوں میں پھنڈر سے آگے برست تک کے علاقے کو غذر کہتے تھے ۔ جس محصوص علاقے کو مصنف غذر کا نام نام دیتے ہیں وہ گولوغ موڑی کے شروع میں 'تریچھ' نامی ایک گاؤں ہے ۔ اسی گاؤں میں ٹیلے کے اوپر ایک قلعہ ہوا کرتا تھا جسے مقامی لوگ' تریچھو نوغور" کہتے تھے جس کے اب صرف نشانات ہی باقی ہیں۔

لوگ یہاں سے تقریباً چار میل اوپر ٹیرو نامی گاؤں میں اس لیے مامور تھے کہ دشمن اگر ناگہانی طور پر درۂ شندور عبور کرے تو اس کی خبر دے سکیں۔ ہنزہ گروپ کی سربراہی وزیر ہمایوں جبکہ نگر والوں کی قیادت وزیر تایفو کر رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری وزیر ہمایوں سے اچھی خاصی شناسائی ہو گئی۔ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ ہنزہ کے حاکم راجہ صفدر علی خان نے جب ان کا جینا حرام کیا تھا تو وہ بھاگ کر چترال گئے تھے اور پانچ سال وہاں گزار چکے تھے۔ ان کی واپسی تب ہی ممکن ہوئی تھی جب ہم 1891-92 میں راجہ کو بھگا کر ہنزہ پر قابض ہو گئے۔ وزیر تایفو کو میں اچھے طریقے سے نہ جان سکا کیونکہ مستوج سے چترال کے لیے نکلتے ہوئے نگر لیویز کو وہاں پر چھوڑا گیا۔ بہر حال 31 مارچ کی دوپہر تک لیفٹیننٹ پیٹرسن کی قیادت میں دوسرا دستہ اور کیپٹن اسٹیوارٹ کے ذمے موجود توپ بھی پہنچ گئی۔

اسی دوران تمام دستیاب قلیوں اور گھوڑوں کو جمع کیا گیا جس سے ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ اگلے دن تمام فوج کے لیے دس دن کی خوراک کے ساتھ ہم روانہ ہو سکتے ہیں۔ یکم اپریل کی صبح چھ بجے چار سو پائنرز، دو توپوں، کشمیر انجینئر کور کے چالیس جوانوں اور سو لیویز پر مشتمل ہمارا چھوٹا سا دستہ روانہ ہوا۔ اس کے بعد قلیوں کو سامان اٹھانے کا کہا گیا تو ہمیں ایک غیر متوقع آفت کا پتہ چلا۔ ہوا یوں کہ رات کے اندھیرے میں یاسین کے سو کے قریب قلی اور گھوڑے فرار ہو چکے تھے۔ ہم نے مہربان شاہ کے اثر و رسوخ پر حد سے زیادہ بھروسہ کیا تھا اور ان علاقوں کے لوگ جو مہربان شاہ کے زیر تسلط نہیں تھے بھاگ گئے تھے۔ ان سو قلیوں کی ذمہ داری ہمارے کھانے پینے کے سامان اٹھانے کی تھی اور ان کی غیر موجودگی کا مطلب ہمارے پاس اتنی ہی خوراک ہونا تھا جو ہر سپاہی اپنے ساتھ کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ میں اٹھا کر پہلے لے گیا تھا۔ ہم جتنا کچھ لے سکتے تھے پہلے ہی لے چکے تھے۔ ہمارے بیگ بھرے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ہم کسی طور زائد اسلحہ بھی پیچھے چھوڑنے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔

فوجی دستہ روانہ ہوا ہی تھا کہ ہمیں ان حالات کا پتہ چلا۔ چونکہ کرنل کیلی سب سے آگے تھے اس لیے میں نے قریب ہی سامان سے لدے ایک گھوڑے کو پکڑا، سامان نیچے پھینکا اور کیلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ یقیناً اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ پیش قدمی کو اس وقت تک روکا جاتا جب تک قلیوں کو رسیوں سے باندھ کر واپس نہ لایا جاتا۔ کیپٹن اسٹیوارٹ کے پاس آرٹلری والوں کا بہترین گھوڑا تھا اس لیے انہیں مفرور قلیوں کے تعاقب میں روانہ کیا گیا۔ شاید وہ لوگ سر شام ہی نکل بھاگے تھے اس لیے وہ تقریباً پندرہ میل چل کر صرف چند ایک کو پکڑ تو سکا مگر انہیں واپس لانے میں اسٹیوارٹ کو کافی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ہم اسٹیوارٹ کو اسی شام سات بجے غذر پوسٹ واپس آنے پر راستے میں ملے کیونکہ اسٹیوارٹ کے مفرور قلیوں کے پیچھے نکلنے کے چند لمحے بعد پتہ چلا کہ پچاس کے قریب افراد پاس ہی مختلف گھروں میں چھپے ہوئے تھے جنہیں وہاں سے نکال کر سامان اُٹھا کر چلنے پر مجبور کیا گیا اور یوں ہم چھ دنوں کا راشن اُٹھا کر درۂ شندور پار کرنے اور مستوج کے ساتھ گلگت کے روابط بحال کرنے کے مشکل ترین مشن پر روانہ ہوئے تاکہ پھر ہم مستوج سے چترال کے لیے نکل سکیں۔ مال برداری کے لیے ہمارے پاس چھوٹی نسل کے مقامی گھوڑے اور قلی تھے۔ مجھے اس وقت تک رُکنا تھا جب تک آخری بندہ آگے چلنا شروع نہ کرے۔

غذر پوسٹ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ٹیرو نامی گاؤں کے آخر میں پہاڑی تودہ گرنے کی وجہ سے سفر نہایت مشکل ہو رہا تھا۔ وہاں ایک ایک کر کے قلیوں، گھوڑوں اور توپ بردار خچروں کو نکالا گیا۔ ٹیرو اس علاقے میں آخری انسانی بستی تھی جہاں چند ایک مکانات اور چھوٹے موٹے پودے تھے۔ دوپہر تک میں فوج کے آخری حصے کے ساتھ شامل ہو چکا تھا جو گاؤں کی حدود سے نکلنے والا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، بیٹری والوں کو پیچھے چھوڑ کر انفنٹری والوں کو جا لیا تھا کہ اچانک آگے سے سب کو رُکنے کے احکامات ملنے لگے۔

چونکہ ہم ایک برفیلے تنگ میدانی علاقے میں داخل ہوئے تھے اور فوج ایک ہی قطار میں چل رہی تھی، آگے سے رُکنے کے لیے آئی ہوئی خبر کی وجہ جاننے کے لیے جونہی میں اس مخصوص راستے سے دائیں بائیں ہو جاتا تو برف میری کمر تک پہنچ جاتی۔ اس کے باوجود مجھے آگے پہنچ کر پتہ لگانا تھا اس لیے میں آگے پہنچ گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ آگے راستے کا کوئی نام و نشان تک نہیں بلکہ ہر طرف برف ہی برف تھی۔ بارہا کوششوں کے باوجود اسلحے سے لدے خچر آگے نہیں چل پا رہے تھے۔ ہم نے راستہ تبدیل کر کے وادی کی دوسری طرف چلنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ راستہ نہ ہونے اور برف نہایت نرم ہونے کی وجہ سے جانور اس میں دھنس جاتے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بیکار کوششوں کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ حالت میں کوئی بھی جانور یہاں سے آگے نہیں جا سکتا۔ ہم لنگر کے میدان کی طرف تیرہ میں سے صرف آٹھ میل چلے تھے اور تین بج چکے تھے۔ مجبوراً مارچ واپس موڑنے کا حکم سنایا گیا اور ہم الٹے قدموں واپس غذر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اگرچہ سامان سے لدے یا خالی جانور درۂ شندور پار نہیں کر سکتے تھے مگر انسانوں پر ایسی کوئی قدغن نہیں تھی۔ لہٰذا چار بجے ٹیرو پہنچ کر ہم کچھ مدت کے لیے رکے۔ کیپٹن بورڈیل اور لیفٹیننٹ کاب کے ساتھ دو سو افراد پر مشتمل دستہ بشمول لیفٹیننٹ اولڈھم کی قیادت میں انجینئرنگ کور کے جوانوں اور ہنزہ لیویز کے ایک دستے کو وہاں چھوڑ دیا تاکہ یہ لوگ کل ایک بار پھر درہ عبور کرنے کی کوشش کریں۔ تمام قلیوں کو بھی بورڈیل کی نگرانی میں دیا گیا کہ درہ پار کرتے ہی وہ ان تمام کو واپس بھیجے تاکہ ہم باقی ماندہ فوج کے ساتھ ان کے پیچھے نکل سکیں۔ انہیں درہ عبور کرتے ہی وادیٔ چترال کے پہلے گاؤں لاسپور (مقامی طور پر ڑاسپور کہا جاتا ہے) میں محفوظ پڑاؤ ڈالنا تھا یا پھر اگر حالات موافق ہوئے تو مستوج کے ساتھ رابطے بحال کرنا تھا۔

توپوں کو واپس غذر بھیج دیا گیا اور ہم بورڈیل کی پارٹی کی پیش قدمی کا بندوبست کرنے لگے۔ یہ کافی پریشان کن مرحلہ تھا۔ پہلے تمام گھوڑوں سے سامان اتارنے تھے پھر شندور کی طرف جانے والی پارٹی کے سامان الگ کرنے تھے۔ ان کے مطلوبہ بارود اور اسلحے ان کے حوالے کرنے تھے اور باقی کو جلد از جلد گھوڑوں پر لاد کر غذر روانہ کرنا تھا۔ اس پورے مرحلے کے دوران ہمیں قلیوں پر نظر رکھنی تھی کہ کہیں وہ دوبارہ سے بھاگ نہ جائیں۔ جانوروں کو غذر کی طرف روانہ کرتے ہی ہم نے قلیوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان پر پہرہ بیٹھا دیا۔ پیش قدمی کرنے والے دستے کے سپاہیوں کو مختلف گھروں میں ٹھہرا دیا گیا اور یوں یہ مشکل کام اختتام کو پہنچا۔

سات بج چکے تھے، اندھیرا چھارہا تھا اور برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ہم سب افسر سے لے کر سپاہی تک، کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے اور مزید بھیگتے جا رہے تھے۔ اسمتھ جو کہ کل بورڈیل کی پارٹی کے ساتھ جانے والا تھا کہیں قریبی مکان میں آگ جلانے اور چائے بنانے میں کامیاب ہوا۔ چائے پینے کے بعد ہم نے کل روانہ ہونی والی پارٹی کو دعاؤں کے ساتھ الوداع کہا اور اندھیرے میں غذر کی طرف نکل گئے۔ جو بندے ہم سے پہلے غذر کی طرف نکلے تھے وہ ہمارے پہنچنے تک اپنے سابقہ مکانات پر قبضہ جما چکے تھے۔

راستے میں ہماری ملاقات کیپٹن اسٹیوارٹ سے ہوئی جو صبح مفرور قلیوں کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ وہ پہاڑی پر بیٹھے اس بات پر آہ و فغاں کر رہا تھا کہ ان کی توپیں واپس غذر بھیج دی گئی تھیں۔ ساتھ ہی وہ پُر عزم بھی تھا کہ کسی بھی صورت میں توپ لے کر درہ عبور کرنا چاہیے، چاہے انہیں کاندھوں پر اٹھا کر کیوں نہ لے جانا پڑے۔ وہ کہتا تھا کہ رات میں برف سخت ہونے کی وجہ سے خچر آسانی سے توپ لے کر درہ پار کر سکتے ہیں۔

بہر حال ہم رات ساڑھے آٹھ بجے واپس انہی جھونپڑوں میں آ گئے جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ ہمیں گرم خوراک کی طلب ہو رہی تھی۔ چونکہ ملازمین ہم سے کافی پہلے واپس آئے تھے اس لیے کھانا بننے میں دیر نہیں ہوئی اور صبح ساڑھے پانچ بجے سے بھوکے ہم لوگوں نے رات نو بجے کھانا کھایا۔ ہم برف کے اُوپر تقریباً سولہ میل کا فاصلہ پندرہ گھنٹے تک پیدل چل کر طے کرنے کے باوجود بد قسمتی سے واپس اُسی جگہ آئے تھے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ دوپہر سے ہم بھیگے ہوئے تھے سردی اور یخ بستہ ہواؤں کی وجہ سے ہمارے چہرے کی جلد جگہ جگہ سے اکھڑ رہی تھی اور ان سب کے باوجود ہم خوش قسمت تھے کہ ہمارے پاس سر چھپانے کو چھت موجود تھی۔ برف باری مزید شدید ہوئی تھی کھانا کھاتے ہی ہمارے تھکے ماندہ جسم بستر پر دراز ہو گئے۔

دو اپریل کو ہم صبح سویرے اُٹھے مگر اسٹیوارٹ اور گاؤف ہم سے کافی پہلے جاگ چکے تھے۔ وہ چھوٹی ریڑھیاں بنا رہے تھے جن پر بوجھ لاد کر کھینچا جا سکے اور ان پر سامان باندھ کر کھینچنے کی مشق کر رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ کامیابی سے مسرور چہرے لے کر قسمیں کھا کر بتا رہے تھے کہ وہ دونوں مل کر اسلحوں کی پوری کھیپ باندھ کر برف کے اُوپر آدھے میل تک کھینچنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے چہرے کامیابی کی نوید دے رہے تھے اور وہ پُر عزم تھے کہ توپ اور اسلحہ آسانی سے کھینچ کر درے کے پار لے جا سکتے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے برف اب تک پڑ رہی تھی اور سارے قلی بورڈیل کے ساتھ پہلے دستے کی صورت میں جانے والے تھے۔ وہ لوگ جب واپس آتے تبھی توپ کھینچ کر لے جانے کے خیال کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا تھا۔ دوپہر کو بورڈیل کا پیغام ملا کہ شدید برف باری کی وجہ سے وہ لوگ اب تک روانہ نہ ہو سکے ہیں اور اب اگلی صبح ہی ایک اور کوشش کی جا سکتی ہے۔

شاہ مرزا میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اس گاؤں میں ایک مُلا ہے جو روحانی طاقت کے بل بوتے پر چند سکوں کے عوض یقینی طور پر برف باری رُکوا سکتا ہے۔ میں نے فوراً پوچھا کہ ملا کو سامان اٹھانے والی قلیوں میں شامل کیوں نہیں کیا گیا ہے؟ جواباً بتایا گیا کہ وہ اُدھیڑ عمر کے ہیں۔ میں نے شاہ مرزا سے کہا کہ

مُلااگر برف باری رُکوانے میں کامیاب ہوا تو سرکار اسے بہت بڑا انعام دے گی۔ فی الوقت چند روپے انہیں تھما دیے گئے تو مُلا کی دعاؤں پر کامل یقین والا شاہ مرزا اُمید اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں مُلا کے گھر کی طرف نکل گیا۔

شاہ مرزا کے نکلتے ہی لیفٹیننٹ گاؤف اندر آئے اور بتایا کہ غذر پوسٹ میں تعینات کشمیر رجمنٹ کے جوان برف کے اُوپر راستہ بنانے کے لیے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں اور اگر وہ ان میں سے پچاس کو لے کر چار دن کے راشن سمیت ٹیرو جائے تو درۂ شندور کے اِس پار لنگر تک توپ لے جانے کے لیے راستہ بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس تجویز پر کرنل کیلی کی اجازت لینے کے بعد ہم نے گاؤں میں جتنے بیلچے اور کدال مل سکتے تھے جمع کر لیے۔ میں نے خود اس مُلا کا کدال بھی اٹھا لیا۔ اس پر وہ کافی دلبر داشتہ ہوا تو میں نے کہا کہ برفباری روکنے کے لیے آپ کی دعائیں رائیگاں گئی ہیں، ہو سکتا ہے آپ کا بیلچہ کچھ کام آئے۔ گھر گھر تلاشی لینے کے بعد ہم صرف بیس عدد اوزار جمع کر سکے جو ہمارے اپنے بیلچے اور کدالوں کے ساتھ ملا کر تقریباً چالیس ہو گئے۔ ان سمیت گھی کے ڈبوں سے بنی تقریباً چھ ریڑھیاں لے کر گاؤف اور اسٹیوارٹ کشمیر رجمنٹ کے پچاس سپاہیوں کی قیادت کرتے ہوئے اسی دن ٹیرو کے لیے روانہ ہوئے۔

دن کے اختتام پر ہمیں کمسیریٹ کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ ہماری جلانے کی لکڑی اور جانوروں کا چارہ ختم ہو رہا ہے۔ ہم نے اس مقصد کے لیے ایک پارٹی ترتیب دی جو یہاں ہمارے قیام کے دوران روزانہ باہر جا کر جلانے کی لکڑیاں اور جانوروں کے لیے چارہ جمع کرے۔

اگلے دن صبح سویرے کیپٹن اسٹیوارٹ کا پیغام ملا کہ بیٹری والوں کو ٹیرو بھیجا جائے کیونکہ وہاں خچروں کے لیے کافی تعداد میں چارہ موجود تھا۔ ساتھ ساتھ وہ توپوں کو آگے لے جانے کا تجربہ کرنے کا بھی خواہشمند تھا۔ اگرچہ میں نے بیٹری کو اسی وقت روانہ کیا مگر انہیں ٹیرو پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ برف باری تھم چکی تھی، نیلا آسمان نظر آ رہا تھا اور کافی عرصے بعد سورج کی کرنیں تازہ پڑی برف پر منعکس ہو کر آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔

(3 اپریل کو) ناشتہ کرنے کے بعد میں کیپٹن بورڈیل کے گروپ کی کارکردگی کا جائزہ لینے خود ٹیرو چلا گیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں اپنا گھوڑا گاؤں میں چھوڑ کر وہاں سے آگے نکل گیا اور یکم اپریل کو جس جگہ سے ہم واپس آئے تھے وہاں سے تھوڑا آگے مجھے اسٹیوارٹ، گاؤف اور اولڈھم پچاس کشمیری فوجیوں، دو سیپئرز اور مائنرز اور پائنرز کے آخری دستے کے ساتھ ہتھیار اٹھائے اسی ٹریک پر بمشکل آگے جاتے ہوئے نظر آئے جو ان ہی کی ایڈوانس پارٹی کے برف کے اوپر چلنے کی وجہ سے بن گیا تھا۔ پتہ نہیں کس وجہ سے ہماری خود ساختہ ڈبہ نما ریڑھیاں کام نہیں کر رہی تھیں۔ پہلے میں نے سوچا کہ شاید آگے جانے والے ایک ہی صف میں چلنے کی وجہ سے یہ راستہ تنگ ہے اور ریڑھیاں اطراف کی برف میں پھنسی رہتی ہیں۔ بہر حال جب میں ہتھیاروں اور دیگر سامان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ چار چار آدمیوں کا ٹولہ ہر طرف سے ریڑھیوں کو پکڑ کر دھکا دے رہا تھا اور آگے والے کھینچ رہے تھے۔ اگرچہ ہر گروپ کے ذمے پچاس گز تک کھینچنا تھا مگر پھر بھی کام کی رفتار پریشان کن حد تک سست تھی۔ وہ بمشکل ایک گھنٹے میں ایک میل کا فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ سپاہی اور قلی کمر تک برف میں دھنسے جا رہے تھے اور پھر بھی سامان کھینچنے کی سعی کر رہے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ شدید ہوا چل رہی

تھی، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی تیز دھوپ تھی اور جسم پسینے سے شرابور تھے۔ میرا اپنا چہرہ دہک رہا تھا جیسے اس پر گرم پانی انڈھیلا گیا ہو اور اگلے چند دنوں میں پورے چہرے سے جلد اُکھڑ چکی تھی۔

یہاں میں ایڈوانس پارٹی کی اذیتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاہم یاد رہے یہ رپورٹ اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے اس لیے غلطیاں درگزر کی جائیں۔ جب میں غذر کی طرف واپس روانہ ہوا تو وہ پارٹی جو توپ وغیرہ کھینچ کر لا رہی تھی وہ چُمرکھن[11] کی ندی تک پہنچ چکی تھی۔ یہ ندی چُمرکھن نامی ایک پہاڑ سے گزر رہی تھی جو مستوج کے لیے بطور گرمائی گزرگاہ استعمال ہوتا ہے لیکن اس موسم میں ناقابل رسائی تھا۔ اس ندی سے شندور کے مشرقی حصے والا کیمپنگ سائٹ یعنی لنگر کا فاصلہ تقریباً چار میل ہے۔ علاقہ کھلا اور کافی حد تک ہموار ہے۔ اس پارٹی کا مرکزی دستہ ان سے ڈیڑھ میل آگے تھا اور پہلے ہی نالہ پار کر چکا تھا۔ اس وقت چار بج رہے تھے اور آخری دستہ رات گیارہ بجے لنگر کیمپ پہنچ گیا تھا مگر توپ کیمپ سے ایک میل پیچھے چھوڑ کر۔ لنگر میں تقریباً چھ بائی چھ فٹ کی ایک بوسیدہ جھونپڑی تھی جس میں افیسروں کے ساتھ ایک یا دو بیماروں کو ٹھونس دیا گیا۔ باقی لوگ برف کے اوپر آگ جلا کر ایک دوسرے سے چمٹے بیٹھے رہے۔ خوش قسمتی سے اس جگہ جلانے کی لکڑیاں کافی مقدار میں تھیں۔ کافی سارے لوگ اتنے تھکے تھے کہ اپنے لیے کھانا بھی نہیں بنا سکے اور افیسروں کو رات گئے کھانے کو کچھ ملا۔ افیسران سے لے کر سپاہی تک کوئی بھی درست انداز سے نہ سو سکا اور بہت ساروں نے تو آگ کے ارد گرد گھومتے یا پھر خود کو گرم رکھنے کے لیے چھلانگیں لگاتے ہوئے رات گزاری۔

دوسرے دن (4 اپریل کو) صبح سویرے پائنرز اور لیویز شندور کی طرف نکل گئے جبکہ باقی توپوں کو کیمپ تک لانے میں لگ گئے جو میری نظر میں اس دن کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔

لنگر کیمپ سے نکلتے ہی راستہ دائیں ہاتھ پر شندور جھیل سے بہنے والے نالے کے ساتھ ہی چلتا ہے۔ تقریباً ایک میل تک چڑھائی شدید ہے جبکہ اترائی بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ درحقیقت پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ شندور ٹاپ کہاں پر ہے اور اترائی کب شروع ہو گئی۔ یہ پانچ میل لمبی اور سطح سمندر سے بارہ ہزار تین سو بیس فٹ اونچی ہلکی پھلکی اُترائی شندور ٹاپ کہلاتی ہے۔ سارے علاقے میں درختوں کا نام و نشان تک نہیں اور کافی بڑے سائز کی دو جھیلیں موجود ہیں۔ یہاں آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہوائیں نہایت یخ بستہ اور خطرناک ہوں گی۔ دونوں جھیلیں جم چکی تھیں اور مکمل برف زدہ علاقہ سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ سورج اور برف کا یہ امتزاج نہایت بے سکونی اور برف کوری (snow blindness)، زیادہ برف پڑنے کی وجہ سے ضعفِ نظر) کا سبب بن رہا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے دسمبر میں بادلوں سے گھرے ایک دن میں یہاں سے گزرا تھا اور اس سے بچنے کے لیے ساتھ لائی ہوئی عینکیں تک پہننے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

[11] گلگت کی طرف سے چترال آتے ہوئے برست کے آخر میں دائیں طرف جو نالہ آتا ہے وہ چمرکھن نالہ کہلاتا ہے۔ یہاں سے درہ چمرکھن بالائی چترال کے گاؤں کارگین کی طرف نکلتا ہے۔

درۂ شندور کے مشرق میں گلگت کی طرف لنگر واقع ہے جبکہ مغرب میں چترال کا علاقہ لاسپور۔ لنگر اور وادی لاسپور کا فاصلہ دس میل سے زیادہ نہیں تھا تاہم بورڈیل کا دستہ جو صبح پو پھٹتے ہی لنگر سے نکلا تھا رات سات بجے بھی شندور سے گزر کر لاسپور نہیں پہنچا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے لیے سب سے مشکل کام پیاس برداشت کرنا تھا وہ کسی احمقانہ مفروضے کی بنیاد پر کہ جس برف سے گزر رہے ہیں، وہ پیاس بجھانے کے واسطے تھوڑی بہت کھانے سے شدید بیمار ہونگے، برف کھانے سے خود کو روکے ہوئے تھے۔ شام تک وہ پاس کے مغربی حصے تک پہنچ چکے تھے کہ دشمن کے تین آدمی اُوپر سے پتھر گرانے اور لیویز والوں کی ان کو پکڑنے کی سر توڑ کوششوں کے باوجود بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

شندور ٹاپ سے نیچے وادیٔ لاسپور پہنچنے کے لیے تقریباً دو میل کا فاصلہ تنگ گھاٹی کے اندر ہے۔ ہنزہ لیویز کو اطراف میں کھڑا کر کے پائنرز اتنی سرعت سے نیچے اُترے کہ گاؤں والوں کو وہاں سے کھسکنے کا موقع تک نہ ملا۔ اس اچانک آمد سے حیران و پریشان گاؤں والے بظاہر ان کی آمد پر خوش ہو رہے تھے۔ وہاں کے باسی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے فوجیوں کو ہر طرح کی مدد دینے کی پیشکش کی۔ اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے اگلے دن انہیں توپیں لانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہ ساری رات ان کے کچھ گھر خالی کرنے کی استدعا بھی کرتے رہے جو کہ فوج نے قبضے میں لیے تھے۔

اگلا دن (5اپریل) دستے نے حفاظتی انتظامات کرنے، قلی جمع کرنے اور سامانِ رسد بہم پہنچانے کے انتظامات میں گزار دیا۔ سرِ شام کیپٹن بورڈیل کو خبر ملی کی کہ تقریباً تین میل کے فاصلے پر دشمن کے سو تک افراد جمع ہو رہے ہیں۔ بورڈیل چند نفری لے کر معلومات لینے نکل گیا۔ کچھ فاصلے پر چند لوگ دیکھے گئے مگر لیویز والوں کا خیال تھا کہ وہ گاؤں والے ہی ہیں۔ رات گہری ہو رہی تھی لہٰذا وہ واپس آئے مگر کیمپ پہنچتے ہوئے پتہ چلا کہ لیویز کا ایک بندہ غائب ہے۔ معلوم ہوا کہ دورانِ گشت وہ پارٹی سے ذرا آگے نکل گیا تھا اور تب ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپے دو بندے اسے پکڑ کر ساتھ لے گئے۔ اسی شام کشمیر رجمنٹ اور قلی شندور کے دشوار گزار درے سے گزر کر توپ لانے میں کامیاب ہوئے جس سے پائنرز کے درمیان خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اس شاندار کامیابی کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا تھا۔ دو سو پچاس کے قریب ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملا کر شندور کے بارہ ہزار تین سو بیس فٹ کی بلندی پر نرم برف کے اُوپر سے ماہ اپریل کے ابتدائی دنوں میں جو یہاں سال کا بدترین وقت ہوتا ہے دو توپ بشمول کیرتیج اور ہتھیار لے کر ۲۰ میل تک پیدل چل کر آ گئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ افراد بیک وقت اپنی بندوقیں، موٹے کوٹ اور اسی راؤنڈ گولیاں بھی اٹھا لا رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بھیڑ کی کھال سے بنے لمبے کوٹ اوڑھ کر دوراتیں کھلے آسمان تلے برف کے اُوپر زندہ رہنے کی تگ و دو کرتے رہتے تو دن چڑھتے ہی برف کوری اور بے رحم برفانی ہواؤں سے خود کو بچاتے ہوئے ہر قدم پر کمر تک برف میں دھنستے خود کو کھینچ کر نکالتے اور چلنے لگتے۔ یہ سب صرف سپاہی ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے آفیسرز بھی ان کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ خصوصاً کیپٹن اسٹیوارٹ اور لیفٹیننٹ گاؤف جو نہ صرف ان ناگفتہ بہ حالات میں اپنے جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے بلکہ دونوں ہر کام میں اپنی اپنی باری کے مطابق شامل بھی ہوتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگیوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے چشمے بھی ان سپاہیوں کو دے دیے جو برف پر سورج کی کرنیں پڑنے کی وجہ سے دیکھنے کے قابل نہ رہے تھے۔ فوجی زندگی میں اس نوعیت کے کام جوانوں کو افیسروں کا

گرویدہ بناتے ہیں اور وہ ہر حالت میں تابعداری کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بہر حال ان مشکل حالات میں شندور پہلی بار پار کیا گیا اور اب فوج آگے جا کر مستوج اور پھر چترال پہنچ سکتی تھی۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان حالات میں چترالی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی فوج شندور سے ہو کر یہاں پہنچ سکتی ہے۔ لاسپور میں وہ خطوط بھی ملے جس میں لکھا گیا تھا کہ غذر میں فوجی آفیسرز برف کوری اور سپاہی سرمازدگی (frostbite، شدید سردی کی وجہ سے کان، ناک، اور ہاتھ اور پیر کی اُنگلیوں کا ماؤف اور مکمل طور پر بے جان ہونا) کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان کے مطابق اس کڑاکے کی سردی میں شندور کے اُوپر سے کوئی ذی روح زندہ سلامت یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا جبکہ نئی پڑی ہوئی برف نقل و حرکت مشکل بنانے کے ساتھ بینائی ماؤف کرنے کا سبب بن چکی تھی۔ در حقیقت چترالی اس پورے کھیل کو اپنی جیت سمجھ کر اگلے کئی ہفتوں تک کسی کی شندور سے آنے کی کوشش کو ناممکن سمجھ کر سکون سے بیٹھے تھے۔ ان حالات میں ہمارا شندور سے ہو کر چترال میں وارد ہونا ان کے لیے باعثِ تعجب تھا۔

کیپٹن بورڈیل کی پارٹی اور توپوں کو باحفاظت شندور کے پار پہنچانے کی روداد سُنانے کے بعد میں واپس اپنی کہانی کی طرف جاتا ہوں کہ اِس دوران کیلی اور میرا تجربہ کیسا رہا۔

تین اپریل کو شندور سے پہلے آنے والے لنگر کے میدان میں برف کے اوپر توپ کھینچنے والوں کو چھوڑ کر میں واپس ٹیرو چلا گیا تھا۔ راستے میں مجھے جوان مُلا کی کدال اور چند بیلچے لے کر برف چیر کر راستہ بناتے ہوئے نظر آئے۔ بے چارہ ملا۔۔۔! ٹیرو میں مجھے بیٹری کے خچر اور خچر بان بھی نظر آئے جنھیں واپس غذر جانے کا حکم ملا تھا کیونکہ وہاں خوراک کا انتظام تھا اور ساتھ فوج ان کی حفاظت کر سکتی تھی۔ شام سے پہلے میں غذر پہنچ گیا اور حالات کے بارے میں خبر دی لیکن بد قسمتی سے اگلے دن بخار میں مبتلا ہوا۔ میں ملیریا جیسی کسی بیماری کی وجہ سے کپکپا رہا تھا جبکہ میرا چہرہ دہک رہا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ چہرے پر جلد ختم ہو چکی تھی اور پھٹے ہونٹ ہنسنے یا کچھ کھانے سے مزید دکھتے تھے۔ بہر طور میں کچھ ضروری سرکاری خطوط اور دستاویزات کھنگالنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود اس دن بطور اسٹاف آفیسر میں کسی کام کا نہیں تھا۔

کرنل کیلی نگر لیویز اور شاہ مرزا کو لے کر اگلے دن (5 اپریل کو) روانگی کے لیے پُرعزم تھا۔ ہم نے سامان اُٹھانے کے لیے ادھ درجن کے قریب قلی بھی جمع کیے تھے۔ مجھے کیلی کے ساتھ جانا تھا جبکہ باقی پائنرز بورڈیل کی پارٹی سے قلی واپس آنے کے صورت میں روانہ ہونے والے تھے۔ قلیوں کا پہنچنا اگلے دن یعنی 5 اپریل کو متوقع تھا۔

میں سرِ شام ہی سو گیا مگر سونے سے پہلے کرنل کیلی نے مجھے وینولا پاؤڈر دیا جسے میں نے چہرے پر ملا۔ مجھے اس سے پہلے پتہ نہیں تھا کہ یہ ایسے پاؤڈر بھی کسی کام کے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک مبہم سا خیال تھا کہ ایسے سفوف بچوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں مگر اس پاؤڈر کی اس افادیت و ضرورت سے واقف نہیں تھا۔ مگر اب میں اس پاؤڈر ساز کمپنی کو بغیر کسی لالچ اور خواہش کے خراج تحسین پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں مستوج پہنچنے تک یہی سفوف

استعمال کرتا رہا اور تب جا کر میرے چہرے کی مشابہت انسانوں کے چہروں سے ہونے لگی۔ کرنل کیلی کی داڑھی تھی اس لیے وہ کافی حد تک محفوظ رہا۔

اگلے دن میں کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ مجھے بخار نہ تھا اور اس پاؤڈر کی برکت سے میں درد بھی کم محسوس کر رہا تھا۔

ہم نے اپنے سامان اور لیویز کو صبح سویرے روانہ کیا۔ کرنل کیلی اور میں نے کرائے کے گھوڑے لیے جن پر جہاں تک ممکن ہوا ہم سوار رہے اور پھر واپس روانہ کر دیے۔ اپنے لیویز کے دستے کے پاس پہنچنے کے بعد ہم اسی ٹریک سے روانہ ہوئے جو پہلے جانے والوں کی وجہ سے بن گیا تھا۔ اسی راستے پر ہمیں کبھی کبھار ٹوٹے ہوئے اسٹریچر اور بیلچے نظر آتے تھے۔ پہلی پارٹی جس وقت یہاں سے گزری تھی اس کے مقابلے میں برف اب سخت لگ رہی تھی کیونکہ روزانہ اُوپر پڑی برف ہلکی سی پگھل کر پھر سخت ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود ٹریک سے ہلکی سی لغزش بھی ہماری کمر تک برف میں دھنسنے کا سبب بنتی تھی۔

ہمارے گروپ میں اگر کوئی اس برف پر بآسانی چل سکتا تھا تو وہ ایک مشکوک نسل کا bull-terrier کتا 'بِل' تھا۔ مجھے یہ اس وقت ملا تھا جب یہ بہت چھوٹا تھا اور اس کو میں بونجی میں سرکاری دودھ پر پالا کرتا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب مخلوق تھی اور برف پر پڑنے والی سورج کی شعاعوں کی وجہ سے یہ اس حد تک اندھا ہو چکا تھا کہ مستوج پہنچنے تک روزانہ میں اسے گرم پانی میں نہا کر اس کی آنکھیں پکڑ کر کھولا کرتا تھا۔ ان حالات میں وہ کوئی ایک مہینے بعد ٹھیک ہوا تھا۔

اس شام اندھیرا چھانے سے پہلے ہم تھکے ماندے اور بھیگے ہوئے جسم منزل تک پہنچ چکے تھے۔ جونہی ہمارے قلی پہنچے ہم نے برف میں جگہ بنا کر کرنل کا چھوٹا سا خیمہ نصب کیا۔ کیمپ میں ہمیں چند افراد ملے جو اگلی باری میں لے کر جانے والے اسلحے کی حفاظت پر مامور تھے۔ یہ سب معمولی برف کوری کا شکار تھے۔ اِس کے علاوہ اُن کی حالت اچھی تھی کیونکہ ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ کے ساتھ کافی ساری لکڑی اور خوراک موجود تھی۔ میرے سامان پہنچتے ہی میں نے ملیریا کی دوائی نکالی اور اپنے ملازمین اور اردلیوں کو پلا دی اور خود بھی پی لی تاکہ ہم بخار سے محفوظ رہ سکیں۔ ہم اپنے خیموں میں دراز ہو چکے تھے جبکہ ملازمین جھونپڑی کے اندر سو گئے۔ یہ بڑی ہی پُر سکون رات تھی۔

صبح (6 اپریل) سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی ہم جاگ گئے۔ چونکہ ہم کپڑوں سمیت ہی سو گئے تھے اس لیے تیاری کرنے اور ناشتہ کرنے میں کوئی خاص وقت نہیں لگا اور ہم جلد ہی روانہ ہوئے۔ صبح چھ بجے ہم درۂ شندور کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ بالکل ہمارے سامنے سے تیز ہوا چل رہی تھی اور مجھے نہیں یاد کہ میں نے اِس سے قبل کبھی اتنی ٹھنڈک محسوس کی ہو۔ جب ہم شندور پہنچے سورج نکل چکا تھا اور ہوا تھم گئی تھی۔ ہمیں اپنے بڑے بڑے کوٹ اُتارنے پڑے۔ تقریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد میں اونچائی کی وجہ سے بخار (mountain sickness) کا شکار ہوا۔ میری سانس چڑھ رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی چیز میرے سینے اور پیٹ پر کس کر باندھی گئی ہے۔ نتیجتاً ہر سو گز کے فاصلے پر میں رُکتا۔ کرنل کیلی کو ایسی کوئی پریشانی

نہیں تھی اور وہ رکے بغیر چھوٹے اور بھاری قدموں کے ساتھ چل رہا تھا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میں mountain sickness کا شکار ہوا تھا جبکہ میں اس سے پہلے شندور اور اس جیسی کئی پہاڑی دروں سے گزر چکا تھا۔

دوپہر تک ہم شندور کے سب سے بلند حصے پر پہنچ گئے۔ ہم شندُور کی بڑی جھیل کے کناروں سے گزر رہے تھے کہ ہماری ملاقات بورڈیل پارٹی کے واپس آنے والے قلیوں سے ہوئی جو کشمیر رجمنٹ کی معیت میں واپس آرہے تھے۔ وہ ان مشکل حالات کے باوجود نوک جھوک کرتے ہوئے ایسے خوش خرم چلے آرہے تھے جیسا کہ شندور ان حالات میں پار کرنا ان کا معمول ہو۔ مجھے کہنے دیں کہ ان کو حوصلہ دینے اور ہمدردیاں ظاہر کرنے کی ہماری کوشش بے مصرف تھی۔

جلد ہی ہم لاسپور میں اُتر رہے تھے اور بمشکل تین سو فٹ نیچے آتے ہی میری بیماری ختم ہو گی اور میں مکمل طور پر چست و چالاک ہو گیا۔ گاؤں کے کافی قریب پہنچ گئے تھے کہ ایک دستہ ہمارے استقبال کو آ گیا جسے کیپٹن بورڈیل نے ہماری طرف بھیجا تھا۔ دو بجے ہم کیمپ میں داخل ہو گئے جس کی کمانڈ لیفٹینںٹ اولڈ ھم کر رہا تھا جبکہ بورڈیل حالات کا پتہ لگانے وادی کے نچلے حصے کی طرف گئے تھے۔ پہلے دن کی خبر سنائی گئی کہ دشمن ایک جگہ جمع ہوا اور ایک پارٹی ان کے پیچھے گئی تھی جس کا میں نے پہلے ہی ذکر کیا تھا۔ چنانچہ 6 اپریل کی صبح بورڈیل ایک بار پھر جاسوسی کی غرض سے چلے گئے تھے اور اس بار وہ توپ بھی ساتھ لے گیا تھا جو لاسپور والے کھینچ کر لائے تھے اور جو یقیناً اُن کے لیے خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ گاؤف بھی ان کے ساتھ گیا تھا جبکہ پوسٹ کی قیادت اولڈ ھم کے پاس تھی۔ پوسٹ کیا تھی شندُور کی سرد ہواؤں کے ستائے پہلے قافلے کے 26 اور دوسرے کے 30 زخمیوں، لولے لنگڑے اور اندھوں کا مسکن تھا۔ کشمیری فوج کے وہ سپاہی جن میں تھوڑی بہت جان باقی تھی باقی ماندہ ہتھیار لانے کے لیے گئے قلیوں کی نگرانی کے لیے واپس گئے ہوئے تھے۔

جاسوسی کرنے والی پارٹی وادی سے تقریباً تین میل نیچے گئی تو انہیں دشمن کے پُرانے کیمپ کے نشانات ملے۔ دو میل مزید آگے جا کر لاسپور کے ایک گاؤں رامن میں برف ختم ہو گئی۔ ہر کوئی خوش تھا اور یوں وہ ایک بجے گشٹ نامی گاؤں پہنچ گئے جو مرکزی لاسپور (مصنف نے سور لاسپور کو مرکزی لاسپور ہی لکھا ہے) سے گیارہ میل نیچے مستوج سے آدھے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں سے انہوں نے رپورٹ دی کہ وہ دشمن کو دیکھ سکتے ہیں جو گشٹ وادی کے نچلے ترین حصے میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر مورچے بنانے اور خود کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ ایک محدود جنگی مشاورت کے بعد انہیں ان کی حال پر چھوڑ کر واپس کیمپ آنے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ ہماری فوج کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں تھی اور دن بھی ڈھلنے والا تھا۔ رات گئے یہ سب کیمپ پہنچ گئے۔ آج کا دن بھی کامیابیوں سے بھرپور تھا کیونکہ تقریبا 22 میل کا فاصلہ گشٹ آنے اور جانے میں طے کیا گیا تھا اور دشمن کی پوزیشن کے بارے میں اچھی خاصی معلومات لی گئی تھیں۔ بورڈیل پارٹی کیمپ میں داخل ہو کر مجھے اور کیلی کو اُن کی کہانی سُننے کے اشتیاق میں اپنا منتظر پایا۔

بابِ چہارم

لاسپور سے گشٹ تک

اس رات (6اور 7اپریل کی درمیانی رات) ہم نے گائے کا گوشت کھایا۔ یہ ایک معمولی خبر ہوسکتی ہے مگر ہم جیسے گزشتہ چھ ماہ سے چھوٹے گوشت پر تکیہ کرنے والوں کے لیے ہرگز معمولی خبر نہیں تھی۔ اگر بڑا گوشت کبھی مل بھی جاتا تو وہ تازہ نہیں ہوتا بلکہ ڈبوں میں پیک اور محفوظ شدہ۔ اس لیے گائے کا تازہ گوشت ہمارے لیے راحت بخش اور بڑی خبر تھی۔ گلگت چونکہ مہاراجہ کشمیر کا باج گزار تھا اور مہاراجا اور ان کا خاندان گائے کی ذبیحہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر قانونی قدغن لگا چکے تھے لہٰذا ہم میں سے کسی نے بھی گلگت کی حدود میں داخل ہونے سے لے کر اب تک گائے کا تازہ گوشت نہیں کھایا تھا۔ اب چونکہ ہم چترال کے علاقے میں تھے اس لیے مسلمان علاقے میں ہونے کی وجہ سے گائے کاٹ سکتے تھے۔ کوئی قانونی قدغن نہ ہونے کے باوجود ہم نے چوری چھپے یہ سب کیا کیونکہ تقریباً ہمارے تمام سپاہی ہندو تھے۔ یہ سیاہ کارنامہ کچھ یوں انجام دیا گیا کہ پہلی پارٹی کو لاسپور پہنچتے ہی گھر گھر تلاشی کے دوران ایک معصوم سا بچھڑا ملا جسے ایک دم سے اُچک لیا گیا۔ مارنے والے کا نام میں اس لیے ظاہر نہیں کر رہا ہوں کہ مجھے خود نہیں پتہ۔ بہرحال جائے وقوعہ سے تمام شواہد مٹا دیے گئے اور ہمیں اگلے کئی دنوں تک تازہ گوشت کا روسٹ ملتا رہا۔

اگرچہ ہماری پارٹی زندہ دل اور خوش و خرم رہنے کے عادی لوگوں پر مشتمل تھی مگر فی الوقت ہم خونخوار مخلوق لگ رہے تھے۔ اسٹیوارٹ اور گاؤف دونوں برف پر چلتے وقت اپنے چشمے سپاہیوں کو دینے کی فراخدلی کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے خود برف کوری کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ دونوں اپنا زیادہ وقت بھاپ لینے اور اپنی آنکھوں کو سہلانے میں گزارتے تھے۔ ہم سب کے چہروں سے جلد اُڑ چکی تھی، کپڑے پھٹ چکے تھے اور ہم کئی دنوں سے ڈاڑھی نہیں بنا سکے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ گرم رہنے اور ایمرجنسی میں فوری اُٹھنے کی مصیبت کا سوچ کر ہم کپڑوں میں ہی سو جاتے تھے۔ جہاں بستر لگا کر ہم دراز تھے وہ دراصل چترالی ساخت کا ایک مکان تھا۔ جو مختلف حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اور درمیان میں آگ جلائی جاتی ہے۔ اس آگ سے دھویں کا ایک موٹا سا ستون اُٹھ کر اوپر چھت پر بنے چھوٹے سے سوراخ سے نکلتا تھا مگر ساتھ ہی ہمارے سروں پر بھی بادل کی طرح پھیل جاتا تھا۔ ہماری تلواریں اور بندوقیں یا تو دیواروں سے لٹک رہی تھیں یا بڑے بڑے شہتیروں سے۔ پورے کمرے کو ایک یا دو موم بتیاں بمشکل ہلکا سا روشن کر رہی تھیں۔ سُننے والوں کو یہ منظر دلکش اور خوشنما لگ سکتا ہے مگر ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ وہاں کے حالات بہت ہی ناگفتہ بہ تھے۔

چونکہ اس بڑے کمرے میں ہم بعد میں آنے والوں کے لیے گنجائش نہیں تھی اس لیے میں اور کیلی اس کمرے سے ملحقہ ایک اور چھوٹے کمرے میں سو گئے۔ ہمیں سرما کے لیے ذخیرہ کردہ بھوسہ بھی ملا جو ہم نے فرش پر بچھا کر دو فٹ موٹی تہہ بنا دی اور اپنے کمبل اس کے اُوپر بچھا دیے۔ کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ ہم بمشکل پاؤں بچھا کر سو سکتے تھے۔ تاہم ان حالات میں اس سے زیادہ نرم، گرم اور پر تعیش بستر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں ماچس جلانے سے

محتاط رہنا تھا اس لیے سونے سے پہلے اپنے سگار باہر رکھنے پڑتے تھے۔ اس مقصد سے کہ برف کوری میں مبتلا سپاہیوں کو آرام دیا جا سکے یہاں رُکنے کا حکم پہلے ہی صادر ہو چکا تھا لہٰذا ہم صبح سویرے اُٹھنے کی اذیت سے آزاد لمبی تان کر سو گئے۔

دوسرے دن یعنی اپریل کی ۷ تاریخ کو ہم یہاں ٹھہرے رہے تاہم اگلے دن کُوچ کرنے کی تیاریوں میں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ ہم نے قُرب وجوار کے تمام گاؤں میں ہرکارے دوڑا دیے کہ اگر اپنے گھر بار جلانے کی اذیت سے بچنا چاہتے ہیں تو آکر ہماری تابعداری کا اعلان کریں۔ اب چونکہ ہم زیادہ بااثر تھے اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے گاؤں اُمڈ آئے اور اپنے ساتھ ہمارے لیے کھانے پینے کے اسباب بھی لائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں یہاں سے آگے سامان اُٹھانے اور دو توپ کھینچنے کے لیے قُلیوں کی اچھی خاصی تعداد مل گئی۔ دوپہر کے قریب پُنیال کے راجہ اکبر خان، جس کی ہم سے ملاقات کا ذکر میں شروٹ سے سنگل تک کے سفر کے دوران کر چکا ہوں، پچاس سپاہیوں اور ۹۰ بلتی قلیوں کے ساتھ سامانِ رسد لے کر کیمپ میں داخل ہو گئے۔ اب ہم مزید بااثر اور طاقتور ہو چکے تھے لہٰذا کیلی نے لیفٹیننٹ پیٹرسن کی فوج کا انتظار کیے بغیر اگلی صبح آگے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا کہ مستوج کے ساتھ رابطہ بحال کرنا ہماری اولین ترجیح اور تزویراتی ضرورت تھی۔

اسی سہ پہر لیویز کے سرداروں، راجہ اکبر خان، ہمایون، تایفو، شاہ مرزا اور دو شہزادے جو جنگ دیکھنے آئے تھے ہمارے کمرے میں آتش دان کے آس پاس مشاورتی چائے پر بیٹھ گئے۔ ہم تب تک بسکٹس چباتے اور چائے کی چسکیاں لیتے رہے جب تک میس آفیسر نے بل بھیجنے کا عندیہ نہ دیا۔

ہمیں ہمیشہ سے اوّلین اور قابل بھروسہ خبر لیویز سے ملتی تھی۔ کیونکہ ان میں سے اکثریت کے چترالیوں کے ساتھ خاندانی رشتے تھے۔ ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ گندم اور دوسرے خوردنی اشیاء کہاں چھپائی جاتی ہیں۔ عموماً بڑے کمرے میں آتش دان کے نیچے یا آس پاس ان اشیاء کو ذخیرہ کیا جاتا تھا مگر ہم نے نوٹس کیا کہ بعض اوقات لیویز انتہائی غیر متوقع جگھوں جیسا کہ زیرزمین اسٹور سے بھی انہیں نکال لاتے تھے۔

۸ اپریل کی صبح وہ دستہ تیار تھا جسے ۹ بجے روانہ ہونا تھا۔ بے چارے گاؤف کو لاسپور کیمپ جو تقریباً سو افراد پر مشتمل تھا جس میں 25 کشمیر رجمنٹ جبکہ باقی نگر اور پونیال لیویز والے شامل تھے کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ دوسری پارٹی پہنچتے ہی لیویز کو بھی وہاں سے نکلنا تھا۔ ہماری فوج ۲۰۰ پائنرز، ۲ توپوں، ۴۰ کشمیر سیپئرز اور ۵۰ ہنزہ لیویز پر مشتمل تھی۔ ہم اس ترتیب سے چلے کہ سب سے پہلے لیویز تھے۔ پھر تقریباً سو گز چھوڑ کر پائینرز کی نصف کمپنی بطور ہراول دستہ، پھر مرکزی دستہ جو کشمیر سیپئرز، توپ اور پائینرز کی ایک کمپنی، اسلحوں، ہسپتال کے سامان، اور آخر میں پائینرز کی نصف کمپنی حفاظتی دستے کا کام دے رہی تھی۔ ایڈوانس اور آخری دونوں دستوں کی قیادت انگریز آفیسرز کر رہے تھے۔ یہ نہایت خوبصورت صبح تھی۔ ہمارے سارے ساتھی پُرجوش تھے اور یقیناً ایک بڑی وجہ نہایت واہیات قسم کی برف کو پیچھے چھوڑ کر آنا تھی جو ہر وقت پریشانی اور مصیبتوں کا سبب بنتی رہتی تھی۔ بے چارہ لیفٹیننٹ گاؤف پیچھے رہنے پر نہایت رنجیدہ تھا مگر یہ جنگ کا اصول ہے۔ گاکوچ، گوپس اور غذر میں مقامی اور انگریزی دونوں آفیسر اور فوجی یہی منتیں کر رہے تھے کہ انہیں بھی ساتھ چلنے دیا جائے۔ خصوصاً مقامی اس بات کا اضافہ ضرور کر دیتے تھے کہ ان کی شمولیت کے بغیر جنگ ہونے کی

صورت میں وہ اپنی بیویوں کو منہ نہیں دیکھا سکیں گے۔ جبکہ فوجی نظم سے ضبط سے مجبور انگریزی افیسر ان فیصلوں کو کوتاہیِ قسمت سمجھ کر تسلیم کرتے تھے۔

(۱۸ اپریل کی صبح) رختِ سفر باندھ کر ہم نے گاؤں کی حدود سے نکل کر نالے کو ایک خستہ حال پل کے ذریعے پار کیا اور پھر نالے کے بایاں ہاتھ تقریباً ایک میل تک چلنے کے بعد ایک چھوٹے گاؤں تک پہنچے جس کا نام میں بھول گیا ہوں (مصنف لاسپور کے گاؤں بالیم کا ذکر کر رہا ہے)۔ یہاں میں نے لاسپور کے حاکیم محمد رفیع کی تلاش شروع کر دی۔ یہ سفید بالوں والا عمر رسیدہ بدمعاش لمبے عرصے سے ہمارے ساتھ مکاریاں کر رہا تھا اور آخر کار کھلم کھلا دشمنوں کی صفوں میں شامل ہو چکا تھا۔ ان کے جرائم کی پوٹلی کافی بھاری تھی۔ یہ بھی مانا جاتا تھا کہ ۱۸۷۲ میں قتل ہونے والے جارج ہیوارڈ (George Hayward) کے اصل قاتلوں میں سے ایک یہ بھی تھا۔ ان سب کے لیے اسے جواب دہ تو ہونا تھا۔

ہیوارڈ دنیا کی سیاحت پر نکل کر یاسین میں تھا جب اِن وحشیوں نے اُن کے کیمپ پر حملہ کر کے اسے گھسیٹ کر قتل کی نیت سے ایک تختے پر لائے۔ ہیوارڈ نے اُن سے صبح تک زندگی کی مہلت مانگی تا کہ وہ ایک آخری بار دنیا دیکھ سکے۔ ان کی بات مان کر صبح سویرے ان کا سر تن سے جدا کیا گیا۔ بے چارے ہیوارڈ کی جسدِ خاکی کو گلگت لایا گیا اور وہ برٹش ایجنسی کے قریب ایک باغ میں مدفون ہے۔ میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ جارج ہیوارڈ یا قدرت کی عظمت اور رنگینیوں کا دلدادہ کوئی بھی انسان، موت سے چند ساعتوں کی دوری پر برف سے ڈھکی چوٹیوں اور ننگی چٹانوں سے نیچے اُترتی سورج کی روشنی جیسے مناظر کو دیکھ کر موت کے سائے میں اپنی ہستی کو کتنا لاچار اور بے بس پایا ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ ہیوارڈ کے حوصلے اور جرات نے سنگدل قاتلوں کے دل کسی حد تک پسیج لیا تھا۔ ایک تن تنہا انسان، گھر بار سے دور، دیارِ غیر میں تختہ دار پر کھڑا قدرت کی رنگینی دیکھنے صبح کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح کی پہلی کرن پہاڑ کی چوٹیوں پر پڑی برف کا رنگ بدلتی رہی۔ روشنی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک سفر کر کے ہر چوٹی کی انفرادیت اور خوبصورتی کو آشکار کر رہی تھی۔ جونہی نیچے زمین سے گرم بھاپ اٹھنا شروع ہوا تو ہیوارڈ نے سر پر کھڑے اپنے قاتلوں کی طرف یہ بتانے کے لیے دیکھا کہ ان کی طرف سے دی ہوئی مہلت ختم ہو گئی ہے۔ بتانے والے تو یہاں تک بتاتے ہیں کہ ہیوارڈ کی لاچاری کو دیکھ کر صنوبر کی درخت کے نیچے کھڑے ان قاتلوں نے کافی ہچکچاہٹ بھی دکھائی تھی۔

محمد رفیع، جو مبینہ طور پر ہیوارڈ کا قاتل تھا، اب لاسپور کا حاکم بن چکا تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ اب دشمنوں کی صفوں میں کھڑا ہو چکا تھا۔

جب میں گزشتہ سال نومبر کے مہینے میں لاسپور سے گزرا تھا تو یہ بڑھا بدمعاش سلام کرنے حاضر ہوا تھا اور مستوج جاتے ہوئے کافی راستے تک میرے ساتھ چلا تھا۔ دورانِ سفر ایک گھر میں جا کر کچھ ہدایات بھی دی تھیں جو بقول ان کے اس کا دوسرا گھر تھا۔ وہاں سے گزر کر میں نے سوچا کہ شاید ایک بار دیکھنا مفید ہو سکتا ہے۔ اس لیے شاہ مرزا اور ان کی سپاہیوں کو ساتھ لے کر میں نے اس گھر کی تلاشی لینے کی اجازت لی۔ گھر کا دروازہ توڑ کر اندر جاتے ہی آتش دان میں بڑی پتیلیوں اور ایک دوسرے کمرے میں لٹکائے ہوئے تازہ گوشت سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ مکان کو حال

ہی میں خالی کیا گیا تھا۔ محدود تلاشی کے ساتھ ہی ہمیں کئی من گندم کا ذخیرہ مل گیا جسے لاسپور لایا گیا۔ جلدی تلاشی کے دوران کوئی قابل ذکر چیز نہیں ملی تاہم میں نے چشموں کا ایک کورا اٹھالیا۔ یہ میرے لیے حیران کن تھا کہ وہاں ان کا کیا کام تھا حالانکہ محمد رفیع نے زندگی بھر چشمے نہیں پہنے تھے۔ میں نے وہ کرنل کیلی کو دکھائے جو فوراً ان پر ایسے جھپٹ پڑا جیسے وہ اپنے والے کھونے کے بعد ان ہی کی تلاش میں تھا۔ شاہ مرزا نے بھی ایک مرغ دبوچ لیا جو یقیناً اس کی اگلی خوراک بننے والا تھا۔

ہماری فوج بمشکل ایک میل دور جا کر ایک نالہ عبور کر رہی تھی کہ ہم بھی پہنچ گئے۔ یہاں سے اگلے گاؤں رامن تک راستہ قدرے ہموار تھا اور برف صرف کونے کھدروں میں رہ گئی تھی۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے رُکے۔ رامن کے پہاڑوں سے ایک نالہ چترال پہنچ جاتا ہے جسے گولین گول کہتے ہیں جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ تاہم فی الوقت یہ نالہ برف سے ڈھکا ہوا تھا اور یہاں سے جانا ناممکن تھا۔

یہاں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اس دوران گاؤں کا نمبردار سلام کرنے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ غذر کا ایک بندہ آج دشمن سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ گاؤف کا مخبر تھا جو مستوج لیفٹیننٹ موبرلی کے پاس پیغام اور خطوط لے جاتے ہوئے گرفتار ہوا تھا۔ میں نے ہیڈ مین سے کہا کہ بہتر وفاداری یہ ہوتی کہ آپ اس بندے کو ساتھ لے کر آتے۔ اس نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا اور رات گئے تک وہ بندہ ہمارے گشٹ والے کیمپ میں تھا۔ اس مخبر سے ہمیں بہت کم معلومات ملیں۔ صرف اتنا کہ دشمن مستوج اور گشٹ کے درمیان کہیں مقابلے میں آئے گا جو کہ بعد میں صحیح ثابت ہوا۔ اُسے دشمن کی تعداد تک کے بارے علم نہیں تھا کہ آیا وہ سینکڑوں میں ہے یا ہزاروں میں۔ حالانکہ وہ پندرہ دن سے زیادہ دشمن کی قید میں تھا۔

میں نے قیدیوں سے معلومات حاصل کرنے کا بہتر طریقہ یہ نکالا تھا کہ ان کو شاہ مرزا یا ہمایوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ قیدیوں کے ساتھ آگ کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور باتوں باتوں میں ان سے سب اُگلوا لیتے۔ یقیناً میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے ان کی زبان نہیں آتی تھی اور پھر ایک فرنگی کی موجودگی انہیں کھلنے نہیں دیتی تھی۔

رامن اور مستوج کے درمیان علاقہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ برف سے ڈھکے بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ گھاٹی، گاؤں کہیں پتھریلا کہیں صاف البتہ پہاڑوں کے دامن میں واقع میدان پہاڑوں سے گرے چھوٹے بڑے پتھروں سے اٹے پڑے تھے۔ راستے کے ساتھ ساتھ دریا کا پانی مسلسل شور کرتا ہوا بہہ رہا تھا اور پہاڑ کے اختتام پر سو دو سو گز نیچے گاؤں۔ قدم قدم بہتے نالے تھے جو برف پوش پہاڑوں سے ٹھنڈا پانی نیچے دریا تک لاتے تھے۔ کچھ نالے گزشتہ سال اپنی لائی ہوئی زرخیز مٹی کی زمین سے گزر کر دریا تک جاتے تھے۔ ہم سہ پہر ساڑھے تین بجے ایسی ہی ایک زمین پر واقع گشٹ نامی گاؤں پہنچے۔ لیویز پہلے ہی گاؤں کے آخر میں ایک ٹیلے پر ڈیرہ ڈال چکے تھے جہاں سے دشمن کو دیکھا گیا تھا۔ خیمہ زنی کے لیے جگہ کا تعین کرنے اور ضروری ہدایات دینے کے بعد حُکام بالا حالات کا جائزہ لینے آگے کی طرف نکل گئے۔

ٹیلے کے اُوپر سے گاؤں کا نہایت دقیق نظارہ ممکن تھا۔ جہاں سے میں نہ صرف یہ اندازہ لگا سکا کہ آگے کی طرف زمین کے اُونچے ٹکڑے کے پیچھے کہیں مستوج چھپا تھا بلکہ راستے کی بھی ٹھیک ٹھاک نشاندہی ممکن ہوئی۔ تقریباً تین میل کے فاصلے پر دریا کی بائیں طرف ہم دشمنوں سے بھرے سنگر کو باآسانی دیکھ سکے۔ ہم یہ اندازہ لگا سکے کہ سنگر دشمن کی فوج کی دائیں طرف واقع تھا۔ ٹھیک اسی جگہ دریا کی دائیں طرف کچھ لوگ ایک عمودی چٹان پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جو اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ ہم نیچے سے گزرنے والوں پر اُوپر سے پتھر گرانے کی مکمل تیاری ہو رہی تھی۔ یہاں کافی عرصے تک ہم اس مخمصے کا شکار رہے کہ دشمن کا مرکزی دستہ دریا کی بائیں طرف تھا یا دائیں۔ بائیں طرف ہونے کی صورت میں ہمیں دریا کے پار جا کر حملہ کرنا تھا جبکہ دائیں ہونے کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے والی سنگر دشمن کا پہلا مورچہ ہو سکتا تھا۔

آخر کار کسی نے چائے پینے کی تجویز پیش کی تو میٹنگ برخاست ہو گئی۔ میں اور کرنل کیلی پیچھے رہے۔ میں نے چند فوجیوں کو لے کر آگے تک جانے کی اجازت طلب کی اور ہنزہ لیویز کے چند جوانوں کے ساتھ اپنے مترجم فقیر کو لے کر گھوڑوں پہ آگے کی طرف نکل گیا۔ اور جب تک دوسرے آفیسرز چائے نوش فرما چکے تھے ہم پہاڑی پر کافی اُوپر چڑھ چکے تھے۔ راستہ خراب ہونے کی وجہ سے ایک ساتھ تیزی سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ ساتھ ہمیں دشمن کی گولیوں سے خود کو محفوظ رکھنا تھا اس لیے ہم ایک ایک کر کے اوپر جا رہے تھے کہ دور سے آنے والی کسی بھی گولی کے لیے ایک بندہ مشکل جبکہ دو آسان ہدف ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہم غیر یقینی صورت حال میں کبھی تیز کبھی آہستہ چل کر دشمن کے فوجی دستے سے کافی اُوپر پہنچ گئے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہم اتنا اوپر پہنچ چکے تھے کہ نہ صرف پوری وادی نظر آ رہی تھی بلکہ دشمن کی پوزیشن ایک نقشے کی صورت میں ہمارے سامنے بچھی ہوئی تھی۔ میں نے لیویز کو سو گز اوپر ایک عمودی چٹان پر پوزیشن سنبھالنے کو کہا اور خود آرام سے بیٹھ کر نیچے پورے علاقے کا نقشہ بنانے لگا۔

چشموں کی مدد سے میں باسانی نیچے سنگر میں موجود بندوں کو گن سکتا تھا۔ ہر سنگر سے نکلنے والے ہلکے دھویں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے لیے رات کا کھانا بنا رہے ہیں۔ میں ان راستوں کی نشاندہی بھی کر سکا جو نیچے دریا سے چٹانوں کی طرف جاتے تھے کیونکہ بندے پانی لانے نیچے جا رہے تھے۔ کافی عرصے تک یہاں بیٹھ کر جائزہ لینے کے بعد میں تمام مطلوبہ معلومات لے چکا تھا جو آنے والے وقتوں میں کافی مددگار ہو سکتی تھیں۔ یہ جگہ اگرچہ پُرامن تھی لیکن سورج پہاڑ کے پیچھے چھپتے ہی شدید سردی شروع ہو چکی تھی۔ لیویز کو سیٹی مار کر اور ہاتھ ہلا کر واپس بلانے کے بعد ہم وہاں سے بمشکل تقریباً ٹھٹھرتے ہوئے اُترنے لگے اور رات کا سناٹا چھانے سے پہلے ہم واپس اپنے خیموں تک پہنچ چکے تھے۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ پُنیال لیویز کو بھی جلد از جلد یہاں پہنچنے کے لیے لاسپور سے روانہ کیا گیا تھا۔

جیسے ہی میں نے دشمن کی پوزیشن واضح کی کیلی نے اگلے دن حملے کے احکامات جاری کر دیے۔ احکامات نہایت سادہ، مختصر اور واضح تھے کہ پنیال لیویز کے پہنچتے ہی وہ ایک رہبر، جسے ہم نے کافی مشکل سے آمادہ کیا تھا، کی معیت میں دریا کی دائیں طرف پتھر برسانے کے لیے تیار دشمن کے سر پر پہنچنا تھا۔ مجھے صبح چھ بجے ہنزہ لیویز کے ساتھ دریا کی بائیں طرف پہاڑ کے اوپر چڑھ کر دشمن کو پیچھے سے دبوچنا تھا۔ جبکہ مرکزی فوج کو نو بجے پیش قدمی کرنا تھی۔

خیمے اپنی جگہ رہیں گے اور سارے سامان کی رکھوالی کمشریٹ کے انچارج سرجن ریویز(Surgeon Reeves)کی ذمہ داری ہوگی۔یوں پورا منصوبہ بناکر کھانا کھاتے ہی سو گئے۔

بابِ پنجم

جنگ چوکول واہت

(۹اپریل) صبح پانچ بجے بڑھے گامر سنگھ گورنگ نے مجھے جگادیا۔ دن ابھی نہیں نکلا تھا جبکہ میں جلدی جلدی مگر آواز پیدا کیے بغیر تیاری کرنے لگا تاکہ میرے آس پاس خراٹے لینے والوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ تیاری سے مراد کوٹ اور تسمے والے لمبے فوجی بوٹ پہننا تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری منزل آسان نہیں جبکہ راستہ دشوار گزار تھا اور ایسے راستوں پر اس قسم کے بوٹ پہن کر آپ ایک میمنے جیسی چھلانگیں لگا سکتے ہیں جبکہ دوسری قسم کے جوتے آپ کو چوٹی سے گرانے کا موجب بن سکتے ہیں۔ جب تک میں کچھ اُبلے انڈوں کے ساتھ ایک کپ چائے پی چکا ہنزہ لیویز والے باہر انتظار کر رہے تھے۔ میں تلوار اور رسی سنبھالے باہر نکلنے لگا تو کرنل کیلی نے مجھے کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا جبکہ باقی گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔

گامر سنگھ اور ہنزہ لیویز کے پچاس جوان تیار تھے جبکہ میں اپنے کندھے پر لٹکے بستے میں کچھ باسی چپاتیاں ڈال کے منزل کی طرف نکل گیا۔ ہمارے گاؤں سے نکلنے کے بعد روشنی پیدا ہو چکی تھی۔ لہٰذا ہم نالے کی ایک طرف چھپ چھپا کر کافی آگے نکل گئے۔ ایک جگہ پہنچ کر ہم نے نالہ عبور کیا اور سیدھی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ہم پہاڑ کے ایک سرے کے پیچھے خود کو چھپا کر برف کی لکیر تک پہنچ گئے۔ یہاں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم پہاڑ پر بنے ہوئے دشمن کے کسی بھی سنگر سے کافی اُوپر آ چکے ہیں۔ ہمارا مقصد ہی دشمن سے اُوپر نکل کر انہیں وہاں سے بھگانا تھا تاکہ نیچے سے گزرنے والے ہمارے فوجی دشمن کی سنگ باری کا شکار نہ ہوں۔

اب تقریباً ساڑھے سات بج چکے تھے اور میں نو بجے سے پہلے دشمن کی دائیں طرف بالکل عقب پر ہونا چاہتا تھا تاکہ ہم بروقت دشمن پر حملہ آور ہو سکیں۔ تاہم حالات موافق نہیں رہے اور ہم ایک ایسی جگہ پر آ گئے جہاں ایک بڑی سی پہاڑی ہمارے سر پر تھی اور نیچے ایک چھوٹی چٹان تھی۔ یہ حصہ ہم نے انتہائی محتاط طریقے سے ایک ایک ہو کر طے کیا۔ ہر قدم بجری اور کنکریوں کے سیلاب کی وجہ بنتا۔ پتھر پاؤں کے نیچے سے کھسک کر دھڑام سے نیچے گرنے لگتے۔ بہترین طریقہ دوڑ کر اسے پار کرنا تھا۔ ہم بحفاظت یہاں سے نکلے مگر آگے راستہ مزید خراب تھا اس لیے ہمیں رُکنا پڑا۔ میں نے کچھ آدمیوں کو اُوپر نیچے راستہ تلاش کرنے کے لیے بھیجا جبکہ میں باقی افراد کے ساتھ ایک محفوظ جگہے پر بیٹھ گیا۔ میں نے دوربین نکالی اور آگے کے علاقے کا جائزہ لیا۔ آٹھ بج چکے تھے اور ہم کافی اوپر آ چکے تھے۔ میں نے خود کو شاباشی دی کہ بس آدھا میل اور طے کرنے کے بعد ہم دشمن کے بالکل اُوپر ٹیلے پر پہنچ کر وہاں سے نیچے جا سکتے تھے۔

میں نے اس ٹیلے کا جائزہ لیا کہ ہمارے بالکل سامنے گھاس پھونس سے بھرا ایک عمودی حصہ ایک پہاڑی سے ہوتا ہوا نیچے دریا تک جاتا تھا۔ ایک بار ہم اس جگہ جاتے تو باآسانی نیچے سنگر پر حملہ کر سکتے تھے۔ بدقسمتی سے وہاں تک جانے کا راستہ پُرخطر تھا جس کا شمالی حصہ برفیلا تھا جس کی وجہ سے وہاں تک رسائی

مزید مشکل ہو رہی تھی۔ اتنے میں ہمارے سامنے زمین سے مٹی اُڑی۔ میں نے بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ ہمارے اس خوبصورت گھاس پھونس والے عمودی راستے کے کونے پر ہی پتھر کے ٹیلے دراصل دشمن کے سنگر تھے! اسی لمحے ان میں سے ایک سنگر سے ایک آدمی نکل کر نیچے بھاگا اور کوٹ اتار کر نیچے والوں کو دشمن کی آمد کی اطلاع دینے لگا اور اسی وقت پتھروں کے درمیان سے کئی آدمی سر نکالنے لگے۔

ہمارے سپاہی ابھی تک راستہ تلاش کر رہے تھے جبکہ ہمایوں کا خیال تھا کہ ہمیں دشمن کے فائر کا جواب دینا چاہیے۔ ایک تو ہمارے پاس صرف چھوٹے ہتھیار تھے اور دوسرا یہ کہ میں نے ابھی تک دشمن کے فائر کی آواز نہیں سنی تھی اس لیے فی لوقت فائر کرنا گولے ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ فاصلہ ماپنے کے لیے میں نے گامر سنگھ سے تقریباً آٹھ سو گز کے فاصلے سے ہماری موجودگی کی خبر دینے کے واسطے چوغہ ہوا میں لہراتے دشمن پر فائر داغنے کا کہا۔ گولی اس بندے کی دائیں طرف زمین پر لگی اور ہمارا اندازہ درست تھا کہ اتنے فاصلے پر مزید فائر کرنے سے اپنا ہی نقصان ہوگا۔

اب ذرا نیچے ہمیں راستہ مل گیا تھا۔ اس لیے میں نے آگے جانے کا حکم دیا اور ہم روانہ ہوگئے۔ ہمارا نظر آنا دشمن کے لیے گولیاں برسانے کی دعوت تھی تاہم ایک دو فائر ہی کیے گئے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دُشمن کے پاس بندوق بہت کم تھیں۔ ہم اسی سیدھ میں تقریباً پانچ سو گز آگے گئے تھے کہ دشمن کی گولیاں ہمارے درمیان لگنے لگیں۔ اس لیے ایک چٹان کی اوٹ لے کر میں نے سپاہیوں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا اور پہلے گروپ کو دوسرے گروپ کے کور فائر کی حفاظت میں آگے روانہ کیا وہ ایک اور پہاڑی کی پناہ لے کر دوسرے گروپ کو کور دیتے ہوئے حرکت کرنے لگے۔

راستہ عجیب و غریب تھا۔ یہ اور بھی پریشانی کا سبب بنتا جب ہم شمال کی طرف حرکت کرتے کیونکہ وہاں برف تھی اور دشمن کی گولیوں کے بالکل سامنے ہونے کی وجہ سے آپ کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا۔ مجھے چلنے کے لیے ایک آدمی کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایسے راستوں پر مارخور کے تعاقب میں جانا شاید اتنا مشکل نہیں ہو سکتا اور نہ مجھے ایسا کرنے پر کوئی اعتراض ہے کہ آپ پر سکون طریقے سے راستے کا جائزہ لے کر چلتے ہیں مگر خود مارخور بن کر چلنا میرے لیے تکلیف دہ حد تک قابل اعتراض تھا۔ ہم رُکے بغیر چلنے کے باوجود دس بجے تک صرف دو سو گز تک چل سکے تھے۔ تاہم اُوپر سے اب نیچے اپنی فوجیوں کو دریا عبور کر کے آگے میدان کی طرف جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

سامنے والا ہمارا دشمن اب پُر جوش ہو رہا تھا اور ان میں سے کئی نیچے والوں کو خبر دینے بھاگ رہے تھے۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان ایک چٹان رہ گئی تھی اور ہمیں وہاں تک پہنچنا تھا۔ جیسے ہی ہم سر اٹھا کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تو دشمن گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتا۔ اس کے باجود ہماری ایڈوانس پارٹی ہمارے کور فائر میں چٹان تک پہنچ گئی۔ اب یہ سب چیخ رہے تھے اور گولے برسا رہے تھے۔ شور اتنا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ معاملہ ختم ہوا ہے۔ پھر نہایت سرعت سے چٹان تک پہنچ کر میں نے دیکھنے کی کوشش کی تو شور شرابے کی وجہ سمجھ آئی۔ ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ڈھلوان تھا جس کے پیچھے سے ایک آخری دشمن فائر کر رہا تھا۔ پھر ہمارے لیویز کی بھرپور فائرنگ کے ساتھ وہ بھی غائب ہو گیا۔ وہ آخری بار تھا جب ہم نے دشمن کو دیکھ لیا تھا۔ تھوڑا آگے ہمیں پھر ایک چٹان کی وجہ سے راستہ بند ملا۔ میں نے چند آدمی اُوپر نیچے بھیجے تا کہ وہ راستہ تلاش کر سکیں۔ جب زخمیوں کے بارے

میں معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ ہم میں سے کوئی بھی زخمی نہ تھا اور شاید دشمن کے آدمی بھی محفوظ تھے۔ یوں اس پہاڑی پر میری پارٹی کا یہ مقابلہ خون بہے بغیر ختم ہوا[12]۔

جس وقت راستہ تلاش کیا جارہا تھا میں اور ہمایوں چٹان کے پیچھے ایک محفوظ کونے میں بیٹھ کر چپاتی کھاتے ہوئے نیچے جاری معرکے کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایڈوانس پارٹی کے سامنے میدان تک پہنچتے ہی مورچوں سے دشمن نے گولہ باری شروع کی جس کا ہمارے دستوں نے بھرپور جواب دیا۔ پھر ایک بھرپور دھویں کے ساتھ سامنے والا ایک سنگر تباہ ہو گیا۔ یہ اتنا خوبصورت نظارہ تھا کہ اسے دیکھنے کی خواہش ہر کوئی کرتا ہو گا۔ مجھے ایسا لگا کہ گویا میں لندن کے Drury Lane تھیٹر میں ہوں۔

میں یہاں ٹھہر کر یہ منظر بخوشی دیکھتا رہ سکتا تھا۔ کتنا دل آویز منظر تھا۔ 32 پائنرز میدان کے آخری کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ دفعتاً نیچے راستہ تلاش کرنے والے گروپ نے آواز دی کہ انہیں آگے جانے کا راستہ مل گیا ہے۔ اسی اثنا میں اوپر موجود دستے نے بھی یقین دہانی کی کہ پہاڑی پر اب کوئی دشمن موجود نہیں لہٰذا ہم بلاخوف وخطر نیچے جا سکتے تھے۔ راستہ کافی عمودی اور مشکل تھا۔ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ جب ہم پہاڑی پر موجود سنگر تک پہنچے تب تک نیچے دشمن فرار ہو چکا تھا اور ہمیں اُترنے میں تقریباً ایک گھنٹہ مزید لگا۔ یہاں میں کرنل کیلی سے ملا اور گھڑی دیکھنے پر پتہ چلا ابھی صرف بارہ بج رہے تھے اور یہ سب کافی جلدی ہوا تھا۔

اب مرکزی دستے کے حملے کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اس کے لیے میں سرکاری ریکارڈ پر تکیہ کرتا ہوں۔ ریکارڈ میں اس کا تذکرہ کچھ یوں ہے،

"۹ اپریل کی صبح میں (کرنل کیلی) دشمن پر حملے کے لیے آگے بڑھا۔ صبح سویرے لیفٹیننٹ بیننین (مجھے) کو ہنزہ لیویز کے ساتھ دریا کی بائیں طرف اوپر پہاڑی پر تعینات کیا گیا تھا۔ پنیال لیویز کو دائیں طرف سے اوپر کی طرف بھیجا گیا تھا تا کہ اُوپر سے پتھر گرانے والوں کو قابو کیا جا سکے۔

میں اس پوزیشن میں آگے بڑھا۔

32 پائنرز کی آدھی کمپنی بطور ہراول دستہ آگے تھی جبکہ مرکزی دستے کی ترتیب کچھ یوں تھی؛

1. کشمیر سیپئرز اور مائنرز
2. نصف کمپنی 32 پائنرز
3. کشمیر ماونٹین بیٹری کی دو توپیں جن کو قلی آگے لے جا رہے تھے۔
4. 32 پائنرز کی ایک کمپنی

سامان آخری دستے کی حفاظت میں گشٹ گاؤں میں پڑے تھے۔ انہیں حملے کے اختتام کے بعد منگوا لیا گیا۔

---

[12] یاد رہے کہ یہ پہاڑی کے اوپر ہونے والی جنگ کے حالات تھے نیچے دونوں طرف سے کافی سارے بندے زخمی اور ہلاک ہوئے تھے۔

دریا کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی جہاں پل توڑا گیا تھا۔ تاہم سیپئرز اور مائنرز پیدل دستے کے لیے اسے کافی حد تک واپس جوڑ چکے تھے۔ توپ دریا میں اتار کر کھینچتے ہوئے پار کروائی گئیں۔ اور جوان دشمن کے مورچوں کو دائیں ہاتھ پر رکھ کر اوپر چڑھنے لگے۔

زمین کا خدوخال کچھ اس طرح تھا۔ گشٹ سے نکلتے ہی دریا کو چھوڑ کر ایک سڑک ہمیں ایک زرخیز قطعہ تک لاتی ہے جہاں تک چڑھائی مختصر مگر عمودی تھی۔ علاقہ پتھریلا تھا جس کے درمیان سے ندی نالے گزر رہے تھے۔ سنگر سے قریباً پانچ سو گز آگے چل کر راستہ دریا کے اُس پار نکل جاتا ہے اور وہاں سے آگے دو میل تک تنگ گھاٹی سے گزرتا ہے۔ راستے کے اوپر عمودی پہاڑی ہے جہاں پر چند افراد موجود ہونے کی صورت میں نیچے والوں پر باآسانی پتھر گرائے جا سکتے تھے۔

دشمن کے سنگرز دریا سے لے کر اوپر والے زرخیز میدان تک بنائے گئے تھے جس کی وجہ سے راستہ بند تھا۔ دشمن کی پوزیشن کا دایاں والا حصہ اوپر گلیشئر اور نیچے بنے سنگر کی وجہ سے مکمل طور پر محفوظ تھا۔

ہم نے کچھ اس طریقے سے حملہ کیا کہ دشمن کے مورچوں کے سامنے آٹھ سو گز کے فاصلے پر ایڈوانس پارٹی اور ان کے پیچھے مرکزی دستے نے پوزیشن سنبھالی۔ اس کے بعد 32 پائنرز نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ سیکشن سی کمپنی ان کے پیچھے مدد کے لیے موجود تھی۔ جبکہ ایک سیکشن سی اور ایک سیکشن اے کمپنی بوقتِ ضرورت استعمال کے لیے رکھی گئی تھیں۔ توپ اب 825 گز کے فاصلے پر سے سنگر نمبر ایک پر گولے داغنے لگی۔ اسی طرح آگے والے آگے جاتے رہے اور پیچھے والے ان کی جگہ سنبھالنے لگے۔ جابجا حملوں کے بعد دشمن نے پہلا سنگر خالی کرنا شروع کیا۔ اس دوران ہمیں اوپر پہاڑی میں گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں جو اس بات کا ثبوت تھا کہ لیفٹیننٹ بینین اوپر سے دشمن پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ پہلے سنگر کو خالی کروانے کے بعد ہم نے اسی منظم طریقے سے دوسرے پر گولے داغنے اور پیش قدمی کرنا شروع کیا۔ نتیجہ بھی وہی نکلا اور دشمن اُوپر سے نیچے میدان میں آنے لگا اور دوبدو لڑائی شروع ہو گئی۔ ہزار، بارہ سو اور تیرہ سو پچاس گز کے فاصلے سے دشمن پر چھ گولے داغے گئے جس سے دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

پھر پیش قدمی شروع کر دی گئی۔ ایڈوانس پارٹی آگے جاتی، پیچھے والے کور فائر دیتی اور یوں ہماری فوج دریا میں اُتر گئی اور اُوپر چڑھ کر پہلے اور دوسرے سنگر پر قبضہ کیا گیا۔ پھر توپوں کو لایا گیا اور یوں تمام سنگر خالی ہو گئے۔ دشمن مستوج کی طرف بھاگ گیا اور ہم دستوں کو دوبارہ ترتیب دے کر ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ دریا کے ساتھ ساتھ ایک میل سے زیادہ چلنے کے بعد پیش قدمی روک کر حالات کا جائزہ لیا گیا۔ ہمارے 32 پائنرز کا ایک بندہ شدید جبکہ کشمیر سیپئرز کے تین جوان معمولی زخمی تھے۔ حملہ ساڑھے دس بجے شروع ہو کر ایک گھنٹے کے اندر ختم ہو چکا تھا۔ دشمن کی پوزیشن، جگہ کی مناسبت سے محفوظ اور ان کے سنگر تکنیکی حوالوں سے مستحکم بنائے گئے تھے۔ دشمن کی تعداد کم و بیش چار سے پانچ سو تھی اور ان کے پچاس سے ساٹھ بندے اس جنگ میں کام آئے تھے۔"

جس وقت میں کرنل کیلی کے پاس پہنچا تھا تب تک آگے والا دستہ دوبارہ سے ترتیب ہو کر روانہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا مجھے دشمن کے سنگر دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ میں بس اتنا مشاہدہ کر سکا کہ ایک دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ گولیاں پتھر کی دیواروں کے بیچ راستہ بنا کر دشمن تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ میں نے سنگرز کے اندر ایک صاف جگہ کھانا پکانے کی بھی دیکھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ دشمن یہاں کافی عرصے سے موجود تھا۔

روانگی نہایت عجلت میں ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ میل آگے آنے کے بعد میدان کے خاتمے پر جہاں دریا وادی کی بائیں طرف کو مڑتا تھا ہمیں چند جھونپڑے نظر آئے۔ یہاں ایڈوانس گارڈ آگے بھیجا گیا اور ان کی حفاظت میں فوج نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے شدید پیاس لگی تھی جو گامر سنگھ کے چند بار دریا تک جا کر واپس آنے سے ہی بجھ گئی۔ گامر اور میں دورانِ سفر ٹین کا بنا ایک ہی مگ استعمال کر رہے تھے۔ اگرچہ مگ اس کا تھا مگر وہ ہمیشہ پانی مجھے پہلے پلاتا تھا اور بدلے میں میری طرف سے اسے تمبا کو ملتا تھا یعنی کہ ہمارے درمیان کام مناسب طریقے سے منقسم تھا۔ یہاں میری چپاتیاں بھی ختم ہو گئیں اور مہربان کیپٹن بورڈیل نے مجھے چاکلیٹ دے دیئے۔ میرا اپنا اسٹاک ختم ہو چکا تھا جو میں نے مستوج میں دوبارہ سے بھر دیا۔

کیپٹن اسٹیوارٹ اس وجہ سے کافی خوش اور پُر جوش تھے کہ ان کی توپ دشمن کو ناکوں چنے چبوا چکی تھی۔ اس کے لیے یہ اندازہ تکلیف دہ تھا کہ اب شاید 24 گھنٹے تک ہمارا دشمن سے سامنا نہ ہو جبکہ وہ چاہ رہا تھا کہ آج سے تو مختصر وقفوں کے ساتھ روزانہ کم از کم بارہ گھنٹے جنگ ہونی چاہیے۔۔۔! اور یہی ایک چیز تھی جو انہیں مطمئن کر سکتی تھی۔

ایک توپ اوپر کھینچتے ہوئے مزدوروں کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گری تھی اور کافی خراب حالت میں تھی۔ تاہم اسٹیوارٹ اس وقفے کے دوران اسے ٹھیک کر چکا تھا۔

اسی اثنا میں سیپرز ایک مکان کو گرا کر پل بنانے کا مشکل کام شروع کرنے کی حکمت عملی میں مصروف رہے تاہم جلد ہی پتہ چلا کہ تھوڑا آگے چل کر دریا اتھلا ہے اور باآسانی چل کر اس پار پہنچا جا سکتا ہے اور یوں پُل تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس دوران سارے جوان خوب آرام کر چکے تھے۔ پوری فوج روانگی کے لیے تیار تھی۔ اس لیے پیچھے سے سامان لانے کے لیے خبر بھیج دی گئی۔

ہم نے سفر شروع کیا۔ پُنیال لیویز دریا کی دائیں طرف جبکہ ہنزہ لیویز بائیں طرف آگے چل رہے تھے۔ مرکزی دستہ ہنزہ لیویز کے پیچھے تھا۔ تقریباً چار بجے ہم دریا عبور کر کے مطلوبہ جگہ پر پہنچے جہاں پانی گھٹنوں سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔ دریا کراس کرنے کے فوراً بعد ہم جس میدان میں پہنچے وہاں مستوج قلعے سے آئے ہوئے سپاہی ملے۔ اگر وہ ہماری توپوں کی آواز سن کر بر وقت آتے تو پسپا ہوتے دشمن کو دونوں طرف سے گھیر کر ہم نیست و نابود کر سکتے تھے۔ بدقسمتی سے مستوج کا قلعہ راستے سے کافی پرے ہٹ کر واقع ہے اور اگرچہ چند سنتریوں نے کہا بھی تھا کہ انہوں نے گولیوں کی آواز سنی ہے تاہم ان کی بات کو غلط قرار دیا گیا۔

تقریباً پانچ بجے کچھ فوجیوں کے ساتھ لیفٹیننٹ موبرلی ملے۔ وہ سب ہٹے کٹے دکھائی دے رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ محاصرہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ کیپٹن روز کی کمپنی 14 سکھ رجمنٹ کی باقیات (یعنی وہ فوجی جو ۲۱ مارچ کو جنگ کڑاک سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے) کو اس ڈھلوان پر پیچھے سے آنے والے سامان کو باحفاظت مستوج پہنچانے کی ذمہ داری دے کر ہم قلعہ ٔمستوج کی طرف نکل گئے۔ (۹ اپریل کی شام) تقریباً ساڑھے پانچ بجے ہم قلعے میں داخل ہوئے۔ لیفٹیننٹ جونز زخمی بازو کو گلے میں بندھی پٹی کی مدد سے سینے پر رکھ کر قلعے میں موجود تھے۔ (یہ وہی جونز تھے جو جنگ کڑاک میں روز کے ساتھ تھے اور ۱۴ سپاہیوں سمیت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے)۔ قلعے کے ساتھ بڑے میدان پر ہماری فوج نے خیمے گاڑ دیئے۔ باغ کے درخت کاٹے گئے تھے تاکہ دشمن چھپ نہ سکے اور حتٰی کہ ایک بڑی دیوار بھی گرائی جا چکی تھی۔ ہم نے ایک گھنٹے کے دوران دیوار کی مرمت کی اور ہمارے دستے پر سکون طریقے سے کھانا بنانے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔

اس قدر اونچائی سے اُتر کر ایسی مناسب آب و ہوا میں آنا نعمت خداوندی سے کم نہ تھی۔ اگرچہ آگ تاپنے کی ضرورت شام کے بعد پڑتی تھی تاہم دن کا روشن سرد موسم شاندار ہوتا تھا۔

موبرلی کے ملازمین نے فوراً چائے اور چپاتی تیار کیے اور جب ہم وہ تناول کر رہے تھے کہ کیپٹن بریتھرٹن (Bretherton) واپس آ گیا جسے ہمارے قلعے پہنچنے پر آس پاس کے علاقہ کا دفاعی نقطہ نظر سے جائزہ لینے اور بوقت ضرورت کلیٔر کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

ہمارے پاس بے شمار خبریں تھیں اور ہم چائے نوش کرتے ہوئے ان خبروں اور واقعات کو جوڑنے میں مگن تھے کہ جس طرف سے سامان آنے تھے وہاں شور بلند ہوا۔

"لعنت ہو ان حبشیوں پر۔ چائے بھی سکون سے پینے نہیں دیتے ہیں" کسی نے کہا۔ شور مچانے والا اسٹیوارٹ کا دستہ نہیں تھا اس لیے سب خنجر اور دیگر ہتھیاریوں کی طرف رینگنے لگے۔ فوراً ایک دستہ آگے دوڑایا گیا اور ہم سڑک کے ساتھ تلاش کرتے آگے جانے لگے۔ ہمیں سامان لانے والا دستہ ملا اور بتایا گیا کہ 14 سکھ رجمنٹ کو دریا کے ساتھ کچھ بندے جاتے ہوئے نظر آئے لہٰذا ان پر فائر کیا گیا تاہم نتیجہ نامعلوم رہا۔ جیسے ہی آخری سامان والا گزرا ہم بھی پیچھے ہو لیے اور آپریشن معطل کیا گیا۔ اسی رات گئے ہم نے لیویز کے ایک بندے کو بطور پیغام رساں گلگت روانہ کیا جس نے جنگ اور قلعہ ٔمستوج کی واگزاری کی داستان سنانی تھی۔ تاہم وہ بندہ جلدی یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ ان کے اور دشمن کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ اس واقعے سے ہمیں یقین ہوا کہ دشمن کی اچھی خاصی تعداد اب بھی آس پاس موجود تھی۔

اس رات قلعے کے اندر کمروں میں چار پانچ آفیسر ایک ساتھ سو گئے۔ قلعہ مستوج معمولی ساخت کی چوکور شکل کی ایک عمارت ہے جس کے چاروں کونوں اور مرکزی دروازے کے اوپر مینار بنے ہوئے ہیں۔ ایک مینار سے دوسرے تک دیوار تقریباً 18 سے 20 فٹ اونچی تھی جبکہ مینار ان سے بھی 15 فٹ اونچے تھے۔ پورا احاطہ مٹی، پتھروں اور لکڑیوں سے مل کر بنا تھا۔ اس کے اندر یقینی طور پر حکمران اور خواتین کے لیے خصوصی طور پر تعمیر کردہ احاطہ

بھی تھا جسے ہم نے افسروں کے زیر استعمال رکھا۔ پورا قلعہ نہایت گندہ اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ افیسروں کا کواٹر مزید خطرناک تھا۔ یہاں دھواں باہر نکالنے کے لیے چھت پر وہی چھوٹا سوراخ تھا تاہم لیفٹیننٹ موبرلی نے اس کے اندر اسٹیو لگا کر اس میں کافی بہتری لائی تھی۔

بابِ ششم

مستوج سے حالات کی جانچ

مستوج میں ہم نے کیپٹن جونز(Captain Jones) سے کوراغ حادثے کے بارے میں سُنا جو کہ کچھ یوں ہے،

7مارچ کے دن مستوج میں مقیم کیپٹن روز کو ایڈورڈز اور فولر پر ریشن کے مقام پر پڑنے والی مصیبتوں کی خبر ملتی ہے[13] اور وہ جونز سمیت تقریباً 93 سکھ سپاہیوں کے ساتھ ایڈورڈز اور فولر کی مدد کرنے کی غرض سے مستوج سے بونی کی طرف نکلتا ہے۔ بونی پہنچ کر وہ 33 سپاہیوں کو ایک مقامی افیسر کی کمان میں دے کر خود 60 سپاہیوں اور جونز کو لے کر اُسی دن ریشن پہنچنے کی اُمید لیے بونی سے روانہ ہوتے ہیں۔

بونی سے آگے راستہ دریائے تورکھو اور دریائے یارخون کے سنگم (چرون) تک خاصا میدانی ہے۔ اسی مقام پر ایک چٹان پر چڑھنے کے بعد راستہ نیچے آتے ہی کوراغ نامی ایک گاؤں آتا ہے جو چند گھرانوں اور کچھ کھیتوں پر مشتمل ہے۔ کوراغ کے بعد دریا پہاڑوں کے درمیان تنگ گھاٹی سے گزرتا ہے۔ جو راستہ دریا کی بائیں طرف جاتا ہے وہ ایک عمودی چٹان سے گری ہوئی کنکریوں اور بجری کے اوپر سے گزر کر پھر نیچے جاکر دریا کے ساتھ چل کر ایک اور پہاڑی تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں سے آگے گرمیوں میں جب دریا میں طغیانی ہوتی ہے تو اس چوٹی پر چڑھ کر جانا ہوتا ہے جبکہ سرما میں پہاڑی کے نیچے سے دریا کے کنارے ہی عارضی راستہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ روز کی پارٹی نے نیچے والا راستہ اختیار کیا۔ اس دوسری پہاڑی کے بعد ایک مختصر میدانی علاقہ آتا ہے جو شاید آدھا میل لمبا جبکہ وسیع ترین جگہ پر تقریباً دو سو گز چوڑا ہوگا۔ اس میدان کے اختتام پر راستہ تیسری بار ایک پہاڑی کے اوپر سے گزرتا ہے۔ یہ پہاڑی دریا کے ساتھ ہی سیدھی کھڑی ہونے کی وجہ سے دشمنوں کی چال کا آخری سرا تھا۔ یعنی کہ گھات لگا کر حملہ کرنے کے لیے اس سے بہتر جگہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کیپٹن روز کی ایڈوانس پارٹی اسی میدان کے آخری سرے تک پہنچی تھی کہ ان پر فائر کھول دیا گیا۔ روز حالات کا جائزہ لینے اور دشمن کا سراغ لگانے آگے بڑھ گیا اور جلد ہی اندازہ لگا سکا کہ اس قدر قلیل فوج کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ تبھی اس نے جونز کو واپس جاکر شروع کی چٹان پر پہنچنے کا حکم دیا تاکہ

---

[13] چترال کمپین نامی کتاب کے مصنف تھامسن کے مطابق لیفٹننٹ ایڈورڈز اور فولر گلگت سے مستوج پہنچنے کے بعد پانچ مارچ کو بونی پہنچتے ہیں اور اگلی صبح چترال آتے ہوئے ریشن میں قیام کرتے ہیں۔ اگرچہ چترال کے حالات ٹھیک نہ ہونے کی خبریں تھیں مگر وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ فرنگی قلعہ چترال میں محصور ہوچکے ہیں ۔ اگلے دن یعنی 7 مارچ کو چترال آتے ہوئے پرپیش نامی گاؤں کے سامنے پہاڑی سے دشمن ان پر فائر کھول دیتا ہے اور اوپر سے پتھر گرائے جاتے ہیں۔ دشمن کی تعداد اور اپنی فوجیوں کو زخمی ہوتے دیکھ کر وہ واپس ریشن آتے ہیں مگر یہاں بھی ان پر حملہ کیا جاتا ہے۔ 8 بندوں کی ہلاکت اور 14 زخمی ہونے کے بعد دونوں باقی سپاہیوں سمیت چند مکانات پر قبضہ کرکے مورچہ زن ہوتے ہیں۔ 9 مارچ کی رات ایک بار پھر ان پر حملہ کیا جاتا ہے اور ان کے 5 بندے ہلاک جبکہ 6 زخمی ہوتے ہیں۔
13 مارچ کو دشمن سفید جھنڈے اٹھا کر ایڈورڈز کی ملاقات شیر افضل کے رضاعی بھائی محمد عیسیٰ سے کرواتے ہیں جو چترال میں امن ہونے کی جھوٹی خبر دے کر ایڈورڈز کو گمراہ کرکے پولو میچ دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور 14 مارچ کو میچ کے اختتام پر موسیقی کی محفل کے فوراً بعد دونوں فرنگیوں کے بیچ کھڑا ہوکر ان کی گردن دبوچ کر انہیں قابو کرتا ہے۔ نتیجتاً قریبی گھر میں موجود انگریز فوجی گولہ باری شروع کرتے ہیں۔ اچھی خاصی تعداد میں لوگ مرتے ہیں مگر دشمن کا پلہ بھاری رہتا ہے اور ان فوجیوں کا قلع قمع کرنے کے بعد ان دو انگریز افیسروں سمیت چند ایک کو قیدی بناکر 19 مارچ کو چترال پہنچاتے ہیں۔ یاد رہے مذکورہ کتاب کے مطابق اس جنگ کے دو بڑے کردار محمد عیسیٰ اور دنیال بیگ تھے۔

دستے کو یہاں سے نکالا جا سکے۔ پہلے فائر کے ساتھ قلی اپنے سامان چھوڑ کر افراتفری اور پریشانی کا شکار ہو گئے اور ایسا لگتا تھا کہ سنگر اور مورچوں میں بیٹھے دشمن کے پہنچنے تک یہ کوئی مدد نہیں کرنے والے ہیں۔ جونز دس آدمیوں کو لے کر گھاٹی کے منہ کی طرف آنے کی کوشش کی مگر جلدی انہیں پتہ چلا کہ وہاں پر دشمن پہلے ہی نہ صرف قابض ہو چکا تھا بلکہ ان کی گزر گاہ سے صرف سو گز کے فاصلے پر پتھروں سے سنگر بھی بنا چکا تھا۔ ان حالات میں ان کے دس میں سے آٹھ آدمی زخمی ہو گئے۔ اس لیے وہ واپس مرکزی گروپ کی طرف آئے جو درمیان والی چٹان کے نیچے چھوٹے چھوٹے غاروں میں پناہ لے چکا تھا۔

یہ غار جو پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے آدھے بھر چکے ہیں تصویر میں دکھائی دیتے ہیں۔ پارٹی ان غاروں میں رات نو بجے تک رہی اور پھر وہاں سے نکلنے کی ایک اور کوشش کی مگر اوپر سے گرائے جانے والے پتھروں سے بچ بچا کر واپس وہیں پہنچ گئے۔ انہوں نے پھر اسی چٹان پر چڑھ کر اوپر جانے کی کوشش کی مگر راستہ خطرناک ہونے کی وجہ سے ایک سپاہی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور یوں باقی سارے تھکے ماندے واپس غاروں میں آ گئے۔ وہ انہی غاروں میں دوسرے دن بھی بند رہے۔ دشمن دریا کی دوسری طرف اپنے سنگر سے کبھی کبھار فائر کرتے رہے مگر سکھوں نے غاروں کے سامنے جو سنگر بنائے تھے وہ انہیں محفوظ رکھ رہے تھے۔

پھر دشمن نے ان کے بالکل اوپر چٹان سے پتھر گرانے شروع کیے۔ لیکن یہ کارروائی جونز پارٹی کے سنگر مزید مضبوط کر رہی تھی اس لیے دشمن کو یہ کوشش بھی ترک کرنی پڑی۔

اسی دن جونز اور روز اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے پاس وہاں سے واپس بھاگنے کی کوشش کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔ ہر کسی نے اپنی قسمت آزمانی تھی اور قسمت کی یہ بازی رات دو بجے کھیلنے کا فیصلہ ہوا۔ 10 تاریخ کی رات مقررہ وقت کے مطابق محصورین اچانک غاروں سے نکل کر دشمن پر فائر کرتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

دونوں اطراف سے اُن پر شدید گولہ باری کی گئی اور اُوپر سے بڑے بڑے پتھر نیچے گرائے جانے لگے۔ ان پتھروں کی وجہ سے کئی فوجی بے ہوش اور بہت سارے ہلاک بھی ہوئے۔ تاہم باقی ماندہ آخری سرے میں موجود دشمن کے سنگرز تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور وہاں موجود دشمنوں کو سنگینوں سے مار مار کر ختم کر دیئے۔ اسی مقام پر بے چارہ کیپٹن روز سر پر گولی لگنے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔ مقامی لوگوں کے مطابق زخمی ہونے کے باوجود بھی انہوں نے چار بندوں کو پستول فائر کر کے ہلاک کیا تھا۔ سنگر سے جان بچا کر بھاگنے والے دشمن نے پہاڑی پر چڑھ کر پتھروں کے پیچھے سے گولہ باری شروع کر دی۔

تاہم جونز کی قیادت میں سترہ لوگوں کا چھوٹا سا دستہ تب تک میدان میں پہنچ چکا تھا۔ ان سترہ لوگوں میں سے بھی جونز سمیت نو سپاہی زخمی تھے۔

یہاں پر یہ چھوٹا دستہ دوبارہ سرگرم ہوا اور دریا کے دونوں اطراف موجود دشمن پر فائر کھول دیا تا کہ ان کا کوئی ساتھی اگر پیچھے ہے تو وہ دشمن سے بچ کر ان تک پہنچ سکے۔ تقریباً دس منٹ تک وقفے وقفے سے یہ عمل دُہرانے کے دوران دو بار جونز کے ساتھیوں کو اچانک سروں پر پہنچنے والے دشمنوں کے ساتھ

تلواروں کے ذریعے دوبدو مقابلہ بھی کرنا پڑا۔اس دوران جونز کو یہ اندازہ لگانے میں مشکل نہیں پیش آئی کہ دشمن ان کی واپسی کا راستہ روک کر ایک بار پھرانہیں گھیرنے کی کوشش میں ہے۔اس لیے نہایت خفیہ طریقے سے پسپائی اختیار کی گئی اور جونز کی ٹیم صبح چھ بجے واپس بونی پہنچ کر پیچھے چھوڑے ہوئے دستے سے ملنے میں کامیاب ہو گئی۔ لیفٹیننٹ جونز اپنی پارٹی کے ساتھ 17 مارچ تک بونی میں رہے تاہم دشمن نے ان پر حملہ کرنے کی ہمت کی اور نہ جونز زخمیوں کو لے جانے کے لیے سواری کی عدم موجودگی کی وجہ سے واپس مستوج روانہ ہو سکے۔

روز کے مستوج چھوڑنے کی وجہ سے یہاں کی کمان لیفٹیننٹ موبرلی کر رہا تھا جبکہ 10 مارچ کو کمشیریٹ کے کیپٹن بیتھرتن دو سپاہیوں کے ساتھ غذر سے ان کے پاس پہنچ چکے تھے۔ موبرلی کو جب پتہ چلا کہ روز ایک چھوٹا دستہ بونی چھوڑ کر گیا ہے تو وہ بونی کی طرف قاصد بھیجتے رہے جو شاید دشمن کے ہاتھ لگ رہے تھے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا تھا۔

13 مارچ کو یہ خبر ملتے ہی کہ دشمن مستوج سے چھ میل آگے نصر گول کے مقام پر اکھٹا ہو رہا ہے موبرلی سراغ لگانے نکل گیا۔ تاہم وہاں صرف چند سنگر اور مورچے بنے تھے اور دشمن کہیں موجود نہیں تھا۔ موبرلی وہ سنگر گرا کے واپس چلا آتا ہے۔

اسی دن غذر سے 60 جوانوں کی مددگار پارٹی پہنچ گئی۔ اگلے دو دن قلی اکھٹے کرنے کی کوشش کی گئی تاہم 16 تاریخ کو قلیوں کی مدد کے بغیر 150 فوجیوں کو لے کر موبرلی بونی کی طرف روانہ ہوئے۔اس گروپ کا ہر بندہ بھیڑ کی کھال سے بنے کوٹ، دو کمبل، 120 راؤنڈ گولی، ہتھیار اور تین دنوں کا تیار کھانا اٹھائے جا رہا تھا۔ موبرلی اپنی فوج کے ساتھ رات سنوغر میں قیام کیا اور وہاں قلیوں کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوا۔ تاہم اسی رات بیتھون کی طرف سے یارخون کے ۵۰ قلی سنوغر بھیجنے کی خبر ملی اور پنیال لیویز کے 50 جوان بھی پہنچ گئے۔ اگلی صبح وہاں سے نکل کر موبرلی شام پانچ بجے بونی جونز اور باقی ماندہ سکھ فوجیوں کے پاس پہنچتے ہیں اور دو گھنٹے بعد واپسی کا سفر شروع کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ساری رات چلتے رہے اور دشمن کا ایک چھوٹا دستہ ان کے پیچھے چلتا رہا تاہم اس دستے نے حملہ کرنے کی جرات نہیں کی۔ اگلے دن یعنی 18 مارچ کی صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان یہ سب بحفاظت مستوج پہنچ جاتے ہیں۔

22 مارچ تک دشمن قلعے کا گھیراو کر چکا تھا۔ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا سوائے دشمن کی فائرنگ سے ایک آدمی کی معمولی زخمی ہونے اور دو گھوڑوں کی ہلاکت کے۔ 9 اپریل کو ہمارے پہنچتے ہی یہ محاصرہ بھی ختم ہوا۔

اگلے دن (10 اپریل 1895) کو جاگتے ہی ہم نے سامان اور سواری کا جائزہ لیا کیونکہ یہی دو چیزیں ہر چھوٹی بڑی فوج کے لیے ہمیشہ پریشانی کا سبب بنتی ہیں۔ ہمیں جلد ہی مستوج میں سپلائی مل گئی۔ مجھے صحیح تعداد یاد نہیں تاہم سپلائی مستوج قلعے میں پہلے سے موجود فورس اور نئے آئے ہوئے ہمارے فوجیوں کے لیے ناکافی تھی۔ کیپٹن بیتھون کو لاسپور سے سپلائی لانے کے لیے بھیجا گیا جبکہ گاؤں والوں کو خبر دی گئی کہ ہمیں نہ صرف اُن کا گندم بلکہ اسے اٹھا کر ہمارے ساتھ لے جانے کے لیے آدمی بھی چاہیے۔ حکم ملتے ہی گاؤں والے اپنے ساتھ معمولی اناج لیے آنا شروع ہو گئے۔

کیپٹن اسٹیوارٹ اپنی توپوں کو کھینچنے کے لیے گھوڑوں کو تیار کرنے میں سخت محنت کر رہا تھا کیونکہ اس کے خچر پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ لیویز کے جوانوں کو ان مکانات میں رکھا گیا جو کچھ عرصہ پہلے دشمن کے قبضے میں تھے۔ اس دوران میں دشمن کے مورچوں کا جائزہ لیتا رہا جو ہماری توقعات کے برعکس تکنیکی اعتبار سے کافی مضبوط بنے ہوئے تھے۔ جس مکان میں دشمن کا کمانڈر محمد اسرار رہائش پذیر تھا وہاں ہم نے درخت کا وہ تنا بھی ڈھونڈ لیا جس کے ذریعے توپ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ حالانکہ مستوج کے قلعے کی دیواروں کو گرانے کے لیے کسی توپ کی ضرورت نہیں تھی اور یہ کام محض مضبوط لات مار کر ہی انجام دیا جا سکتا تھا! جوں ہی ہم چترال پہنچ گئے موبرلی نے خبر بھیج دی کہ دیوار کا ایک حصہ ایک سوئے ہوئے سپاہی پر گر گیا مگر شہتیر گرتی دیوار کو تھامنے اور ملبے کو سپاہی کے سر پر گرنے کی راہ میں حائل رہی۔ دیوار گرنے کی کوئی ظاہری وجہ نظر نہیں آ رہی تھی سوائے اس کے کہ سپاہی نے زوردار چھینک ماری ہوگی!

اگلے دن (11 اپریل) ایک دستہ دشمن کے مورچوں کو برباد کرنے اور کوئی لاش ملنے کی صورت میں دفن کرنے کے لیے چوکل واہت کی طرف روانہ کیا گیا۔ اس پارٹی کو بھیجنے کے مقاصد میں سے ایک لیفٹیننٹ پیٹرسن جو اس دن پہنچ سکتا تھا، کو کور دینا بھی تھا۔ پیٹرسن کے ساتھ لیفٹیننٹ بیتھون اور سرجن لوارڈ بھی آ گئے اور سارے جنگ میں شامل نہ ہونے پر افسوس کر رہے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ فوج کی تعداد چار سو بندوق برداروں تک پہنچ گئی۔

اُسی دن ہنزہ لیویز کے ساتھ پنیال لیویز کے 50 بندوں کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے نصر گول کی طرف روانہ کیا گیا جبکہ پنیال لیویز کے 50 نفری جانوروں کے لیے چارہ اکھٹا کرنے اوپر یارخون کی طرف چلے گئے۔ باقی ماندہ دن رپورٹ لکھنے، دفتری امور نمٹانے اور چھوٹی موٹی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے میں گزر گیا۔

کیلی اور میں ایک خیمے میں لکھنے میں مصروف رہے اور 5 بجے تک میں اپنے کام نمٹا چکا تھا۔ پھر کیلی نے نقشہ جات نکالے اور کیپٹن بورڈیل کو بلا کر مستقبل کے حوالے سے جنگی حکمتِ عملی تشکیل دی گئی۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ کرنل کیلی پنگل میں ہی تہیہ کر چکا تھا کہ ہم قلعہ دراسن سے ہو کر نیچے جائیں گے مگر سوال یہ تھا کہ ہم کب اس قابل ہو جائیں گے۔ یہاں وہی رسد اور ٹرانسپورٹ والا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ اب ہم یقیناً اس پوزیشن میں تھے کہ سردی کے کپڑے، کوٹ وغیرہ یہاں چھوڑ کر آگے جا سکتے تھے کیونکہ سطح سمندر کی نچلی سطح کی طرف جاتے ہوئے دن بدن موسم گرم ہوتا جس کا فائدہ یہ تھا کہ ہر سپاہی اب کم از کم دو دن کی خوراک بھی ساتھ لے سکتا تھا۔ اس طرح ہر قلی پانچ دن کا راشن اٹھاتا اور یوں سات دنوں کا راشن لے کر ہم چترال کی طرف نکل سکتے تھے۔ یہاں سے سیدھا چترال جانے کی صورت میں سات دن لگ سکتے تھے اور ہماری معلومات کے مطابق چترال میں کافی تعداد میں راشن موجود تھا۔ راستے میں ہمیں راشن مل بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔ ہم نے سر توڑ کوشش کی مگر کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اور نہ ایک قلی اس سے زیادہ سامان اٹھا کر اتنا فاصلہ طے کر سکتا تھا۔

اسی دوران راجہ اکبر خان اور ہمایوں واپس آئے اور ہم ان سے معلومات لینے باہر نکل گئے۔ بوڑھے اکبر کے چہرے سے مسکراہٹ عیاں تھی جبکہ موٹی آواز، کالی داڑھی اور لمبی کالی مونچھوں والا ہمایوں مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اکبر خان قدیم عساری بادشاہوں جیسے انداز میں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مسکرا رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کافی ساری تعداد میں دشمن سنگر بنانے میں مصروف ہیں۔ انہیں وہاں پر گھڑ سوار بھی نظر آئے تھے۔ ان کی معلومات اتنی واضح تھیں کہ میں باآسانی ان سنگر کے مقام کی نشاندہی کر سکتا تھا کیونکہ اپنے گزشتہ دورے کے دوران میں لیفٹیننٹ پارلی کے ساتھ اسی جگہ سے گزر چکا تھا۔ معلومات کو مزید پختہ کرنے کے لیے میں نے اگلے دن اس جگہ کے معائنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر اتفاق کیا گیا اور اس بات پر بھی کہ دشمن پر 13 اپریل کو ہلہ بول دیا جائے گا تاکہ وہ گزرتے وقت کا فائدہ اٹھا کر مزید طاقتور نہ بن سکیں اور ہم میں ان کے مقابلے کی سکت ہی نہ رہے۔

12 اپریل کی صبح نو بجے راشن کے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر میں وہاں سے نکلا۔ ہمایوں اور اکبر خان کی قیادت میں ہنزہ اور پنیال لیویز کے تقریباً ۵۰ سپاہی بھی ساتھ تھے۔ یہ نہایت ہی شاندار صبح تھی اور گامر سنگھ کے علاوہ ہم سب ہشاش بشاش تھے۔ وہ میرے ساتھ آنا چاہتا تھا مگر انہیں اگلے دن کی سفر کی تیاری کرنی تھی، سامان پیک کرنے تھے اس لیے مجبوراً اسے چھوڑ کر اس کی بندوق اور کارتوس لے کر وہاں سے نکل گیا۔

ہم کھائی سے نیچے اترے اور جہاں پانی اتھلا تھا وہاں سے پائنچے چڑھا کر دریائے لاسپور کو پار کیا یہاں پانی بمشکل ہمارے ٹخنوں تک آگیا۔ ہم دریا کے کنارے چلنے لگے۔ ہماری بائیں طرف اسکاؤٹس کے کچھ سپاہی تھے جبکہ دائیں طرف دریائے یارخون ہماری حفاظت کر رہا تھا۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد ہم ایک چھوٹے مکان کے احاطے میں پہنچے جہاں ہمایوں کے مطابق ایک زخمی موجود تھا۔ میں اندر گیا۔ ایک بیچارہ دیہاتی جس کے ٹخنوں سے ذرا اوپر گولی لگی تھی، کراہ رہا تھا۔ وہاں پر کافی خواتین، بچے اور زخمی کے دو بھائی بھی تھے۔ میں نے انہیں لوارڈ کے نام ایک پرچی دیا اور زخمی کو مستوج لے جانے کے لیے کہا۔ لوارڈ نے ان کی ٹانگ کا علاج کیا اور وہ بھلا چنگا ہو گیا۔

اس کے فوراً بعد ہم نے دریا کے کنارے سے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ یہاں راستہ عمودی تھا جو دریا سے تقریباً دو سو فٹ اوپر پہاڑی کے دامن تک جا رہا تھا۔ وہاں ہم نے گھوڑے چھوڑ دیئے اور پھسلتے سنگریزوں پر تقریباً رینگتے ہوئے بمشکل آدھا میل اوپر چلے گئے۔ جب ہم ایک بڑے پتھر کے نیچے پہنچ گئے تو دیکھا کہ ہماری ایڈوانس پارٹی والے آگے ایک پہاڑ کے اوپر پہنچ کر رُک چکے تھے۔ پوچھنے پر ہمایوں نے بتایا کہ دشمن دوسری پہاڑی پر قابض ہے۔ للہٰذا ہم اوپر چلے گئے اور حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ لیکن وہ علاقہ کئی ہزار گز آگے تھا لہذا ہم وہاں سے آگے گئے اور دشمن سے تقریباً آٹھ سو گز کے فاصلے پر ایک بہترین جگہ پہنچ گئے۔

یہاں سے میں دشمن کی پوزیشن کا سوائے نصر گول نالے کے آخری کونے کے جہاں وہ دریا میں گرتا تھا قدرے بہتر طریقے سے جائزہ لے سکتا تھا۔ میں نے اور اوپر جانے کی کوشش کی جس سے حالات بگڑنے کا خطرہ پیدا ہوا للہٰذا میں نے وہی بیٹھ کر دشمن کے مورچوں اور حکمت عملی کو نقشے کی شکل دینے کا

فیصلہ کیا۔ چند سپاہیوں کو اوپر اور باقی کو یہاں وہاں ڈیوٹی پر تعینات کر کے میں نے دور بین نکالی اور حالات کا جائزہ لینے لگا جبکہ ہمایوں اور اکبر ایک چٹان کے پیچھے دراز ہو گئے۔

حالات یہ ظاہر کر رہے تھے کہ دشمن ہماری حرکات و سکنات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ مورچوں کے پیچھے سے سر باہر نکال کر ایک نظر دیکھنے کے بعد پھر چھپ رہے تھے۔ لیکن جب ہم آرام سے بیٹھ گئے تو انہوں نے بھی حوصلہ پکڑا اور سنگر سے باہر نکل کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ان کی خاموش تماشائی بننے کا بہت شکریہ کہ اس وجہ سے میں سارے حالات کی جانچ کر سکا۔ اب میرے پاس نہ صرف ان کے دفاعی مورچوں کی تفصیلات تھیں بلکہ یہ تک پتہ تھا کہ ہر سنگر میں کتنے سپاہی ہیں اور ان کے پاس کس نوعیت کے ہتھیار ہیں۔ یہ نہایت پر سکون اور خاموش دن تھا۔ دشمن اپنے مورچوں سے نکل کر دھوپ سینک رہے تھے جبکہ میرے کچھ سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ایک دو سگریٹ کے کش لے رہے تھے اور باقی سو رہے تھے۔

اس دوران میں نے دیکھا کہ ایک دو نوجوان دریا کے اُس پار میدان میں گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا رہے تھے۔ لگتا یہی تھا کہ کمانڈر نے انہیں ہماری حرکات و سکنات کا جائزہ لینے کے لیے آگے بھیجا تھا۔ ہمارے بالکل سامنے پہنچتے ہی انہوں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ ایک نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگادی اور ایک بڑے پتھر کے پیچھے محفوظ ہو کر ہمیں دیکھنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ یہ صرف دیکھتے نہیں رہیں گے میں نے سپاہیوں کو ان پر نظر رکھنے کے لیے کہا اور خود نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ دفعتاً ایک آواز آئی اور گولیاں برسنا شروع ہوئیں۔ وہ بیچارہ سپاہی ایک ہزار گز کے فاصلے سے گولیاں ضائع کرنے کا ناقابل معافی جرم بار بار دُہرا تا رہا۔ احتیاطاً میں ایک چٹان کے پیچھے آ گیا اور نقشہ بنانا جاری رکھا۔ جبکہ دوسرے تمام ساتھی بدستور اپنی سابقہ مصروفیات میں مصروف رہے۔ دریا کے پار سے ہمارا دوست وقتاً فوقتاً احمقانہ حرکت کرتا رہا جسے کافی وقت سہنے کے بعد ہمایوں کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے مجھ سے بندوق مانگ لی اور اکبر کو ساتھ لے کر پہاڑی سے جلدی جلدی نیچے اُترنے لگا۔ وہ دونوں چھپ کر پہاڑی کے نیچے پہنچے اور اب وہ دریا کے اُس پار والے دوست سے تقریباً 800 گز کے فاصلے پر تھے مگر وہ جناب ایک کھلی جگہ پر مست انداز میں بیٹھے وقتاً فوقتاً فائر کرتا رہتا تھا۔ اس دوران اس کا دوسرا ساتھی بڑے پتھر کے پیچھے سے باہر نکلا اور لگ رہا تھا کہ وہ بھی اس کی پرفارمنس سے خوش نہیں تھا۔

اس دوران ہماری طرف سے آواز آئی اور ایک گولی دریا کے اس پار میدان میں لگنے سے غبار اٹھنے لگی۔ ہمایوں فاصلے کو جانچنے میں ناکام رہا تھا۔ جب تک وہ دوبارہ فائر کرنے کے قابل ہو جاتا دونوں سپاہیوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر بھاگنے میں عافیت جانی۔ اس کے باوجود بھی ہمایوں نے چند اور بے ضرر فائر داغ دیئے۔

جیسے ہی ہمایوں نے گولہ باری کی ہمارے سامنے کے سنگر سے شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھنانے کی آواز آئی اور پھر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ لگتا تھا کہ دشمن کے پاس گولہ بارود کافی تعداد میں موجود تھا۔ کچھ لمحے کے لیے کافی گہما گہمی رہی مگر پھر یہ جان کر کہ ہماری طرف سے سرد مہری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے انہوں نے بھی حماقت چھوڑ دی اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

بوڑھے ہمایوں کی واپسی پر میں نے ان کی فائر نگ پر تنقید کر کے اُسے زچ کرنے کی کوشش کی تاہم وہ صرف دانت دکھاتا رہا۔

اب میں دریا کے اُس پار نصر گول کے محاذ پر افراتفری دیکھ رہا تھا۔ سپاہی مورچوں سے نکلتے ایک دو بھاگ کر بظاہر کچھ پیغام پہنچانے اوپر کے مورچوں تک جاتے۔ پھر لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ زیادہ گھڑ سوار تھے جبکہ کچھ لوگ پیدل بھی تھے۔ انہوں نے جھنڈے پکڑے تھے۔ پھر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک موٹا آدمی نظر آیا اور سب سنگروں سے باہر نکلے۔ میں نے گننے کی کوشش کی تو ہر سنگر میں سو سے زیادہ لوگ تھے۔

اُس کمانڈر انچیف نے پورے نالے میں چکر لگایا اور پھر ڈھلوان میں اوپر سنگر نمبر 16 اور 17 میں گیا۔ یہ نمبر میرے نقشے میں دیئے گئے تھے۔ وہاں وہ بیٹھ گیا اور بلاشبہ جنگ جیتنے کے امکانات کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ عرصہ بعد وہ نیچے آیا اور جلوس ان کے ساتھ ہو گیا تاوقت یہ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جونہی میں کام سے فارغ ہوا تو دوربین بند کی اور کہا "اب ہم سب دریا کے پار جائیں گے۔"

ہمایوں نے پوچھا کہ آپ دریا پار کرنا کیوں چاہتے ہیں؟

"میں نالہ کا آخری کنارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"گھڑ سوار تمھیں پکڑیں گے۔" ہمایوں نے جواب دیا۔

"کون سے گھڑ سوار؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے ان میں سے دو کو ابھی دیکھا تھا۔" اس نے کہا۔

"دفعہ ہو جاؤ! تم خواہ مخواہ رکاوٹ بن رہے ہو۔" میں نے کہا۔

صاحب مت جاؤ! اس نے پھر تنبیہ کی۔

"میں نے جانا ہے بس۔"

"جہاں صاحب وہاں ہم۔" ہمایوں نے استقامت سے کہا۔

چند آدمیوں کو وہاں چھوڑ کر اور دشمن کی ہر حرکت کی خبر اشاروں میں ہم تک پہنچانے کا کہہ کر ہم نیچے دریا کے کنارے آ گئے۔ ہم نے گھوڑوں پر سوار ہو کر دریا پار کیا۔ کچھ ساتھی دریا چل کر عبور کر رہے تھے۔ ہم نے اُس پار جانے کے بعد باقیوں کو بھی آنے کا کہا۔

پہاڑ سے ذرا اوپر جانے کے بعد نصر گول نالے کے پنہاں گوشے کو بھی دیکھا جا سکتا تھا جہاں پر ایک بڑا سنگر راستہ بند کیا ہوا تھا۔ یہی چیز تھی جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ سارے حالات کا باریک بینی سے معائنہ کرنے کے بعد ہم اسی طرف سے واپس روانہ ہو کر اولڈ ھم کے تعمیر کردہ پل سے ہو کر دن 1 بجے واپس مستوج پہنچ گئے۔

میں نے کیلی کو رپورٹ دی اور اگلے دن کوچ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

میں نے کچھ ہلکی سیڑھیاں بنانے کی تجویز بھی دی جو نصر گول عبور کرتے ہوئے کام آسکتی تھیں۔ چنانچہ اولڈھم نے سیپئرز کی ٹیم کو اس کام پر لگادیا۔ شام تک تقریباً دس فٹ لمبی دس ہلکی سیڑھیاں تیار تھیں۔ وہ اتنی ہلکی تھیں کہ ایک سیڑھی ایک آدمی آسانی سے اٹھا سکتا تھا۔

کچھ قلی اور راشن اکھٹا کیا جا چکا تھا۔ توپیں گھوڑوں پر لادی جا چکی تھیں۔ لٰہذا اب توپوں کو قلیوں سے اٹھوا کر جانے کے مقابلے میں ہم ذرا تیزی سے آگے جا سکتے تھے۔

ہر چیز صبح سویرے روانگی کے لیے تیار تھی۔ لیفٹینٹ موبرلی نے تصویر کشی کی۔ انہیں اگلے دن جنگ میں کشمیر دستے کی قیادت کرنی تھی تاہم جنگ کے بعد یہ دستہ میری کمان میں چھوڑ کر موبرلی کو واپس مستوج آکر یہاں کی بھاگ دوڑ سنبھالنی تھی۔

اگلے دن (13 اپریل) صبح سات بجے نکلنے کا حکم نامہ سب کو مل چکا تھا۔ سامان مستوج ہی چھوڑنا تھا جنھیں ایک دستہ بعد میں ساتھ لاتا اور اسی دستے کی ذمہ داریوں میں سے ایک جنگ میں زخمی ہونے والوں کو واپس مستوج لانا بھی تھا۔ لوارڈ کو نصر گول میں فیلڈ ہسپتال کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ بعد از جنگ انہیں بھی زخمیوں کے ساتھ واپس مستوج آکر ہسپتال بنانا تھا۔

میں نے موبرلی سے ایک بوتل وہسکی اچک لی تھی۔ یہ وہسکی دراصل فولر کی تھی جو اس وقت یا تو قیدی تھا یا پھر مر چکا تھا اور ہر دو صورتوں میں اسے وہسکی کی ضرورت نہیں تھی! میں نے یہاں چاکلیٹ کا اپنا کوٹہ بھی بھر لیا تھا۔

بابِ ہفتم
نصر گول کی جنگ

اگلے دن یعنی 13 اپریل 1895 کو صبح چھ بجے ہم نے بہترین ناشتہ کیا اور ٹھیک 7 بجے لیویز کی قیادت میں فوج روانہ ہوئی۔ ہماری فوج میں چار سو پیشرو دستہ، دس کشمیری پیدل فوجی، چالیس کشمیری سیپئرز، دو توپیں اور سو ہنزہ و پونیال لیویز کے فوجی شامل تھے۔ اگرچہ ہم ایک بٹالین سے کم تھے اور علاقہ انجان اور دشوار گزار تھا پھر بھی ہم پشاور سے روانہ ہونے والی فوج[14] سے پہلے 70 میل کا فاصلہ طے کر کے چترال پہنچنے کے لیے پر عزم تھے۔

دن نہایت خوشگوار، مطلع صاف اور ہوا تازہ تھی۔ بالکل ایسا ہی دن تھا جب ایک بندہ بندوق اٹھا کر شکار پر جانے کی خواہش کرے۔ یقیناً جنگ کے لیے ایک بہترین دن۔۔۔

جلد ہی لیویز اولڈھم کے بنائے ہوئے پل کو عبور کر چکے تھے۔ تاہم ایڈوانس دستے کو اُسے آرام سے کراس کرنا تھا کیونکہ یہ کافی ہلکا تھا اور صرف چار بندے ایک ہی وقت میں یہاں سے گزر سکتے تھے۔ توپوں کو دریا کے ساتھ 3 سو گز اوپر لے تقریباً جا کر کم گہرے پانی سے کھینچ کر نکالا گیا۔ مرکزی دریا کو پل کے ذریعے عبور کرنے کے باوجود پانی کے ایک اور حصے سے سب کو چل کر گزرنا تھا تاہم وہاں پانی صرف ٹخنوں تک تھا۔ ان حالات نے آگے چلنے والے دستے کو کافی آگے نکل کر دائیں طرف پہاڑ پر چڑھنے کا موقع دیا تاکہ دشمن کی طرف سے غیر متوقع حملے اور اوپر سے پتھر گرانے کے عمل کو سبوتاژ کیا جاسکے۔

جب ہماری مختصر فوج نے دریا عبور کیا تو ہراول دستے کو روک کر صف بندی کی گئی اور پھر ہم روانہ ہوئے۔ پیٹرسن ہراوّل دستے کی قیادت کر رہا تھا جسے یہ ہدایت تھی کہ میدان کے آغاز میں پہنچتے ہی اپنے دستے کو روکے تاکہ مرکزی فوج قریب آئے اور ایسا ہوتے ہی انہیں دائیں طرف پہاڑی پر چڑھنا تھا۔

میدان شروع ہوتے ہی سڑک نیچے دریا کے دامن تک جا کر پھر اوپر میدان تک چڑھتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھ کر درمیان تک جاتی تھی جہاں ایک گہری ندی بہتی تھی۔ نالے کے دونوں اطراف بالکل عمودی تھے اور گہرائی تقریباً 250 سے 350 فٹ تھی۔ نالے کے پانی کا حجم اوپر پہاڑوں میں گلیشیر کے پگھلنے پر منحصر تھا۔ نالے کو پار کرنے کے دو ہی راستے تھے۔ ایک وہ مرکزی سڑک جو چترال کو جاتی تھی نالے کے آخری کونے کے قریب بل کھاتی نیچے جاتی تھی جبکہ دوسرا مال مویشیوں کی بنائی ہوئی باریک پگڈنڈی تھی جو اس مرکزی راستے اور پہاڑی کے بالکل درمیان واقع تھی۔ دونوں راستوں کو نالے کے اُس پار دشمن نے مورچے بنا کر بند کر دیا تھا اور یہاں سے جلد بازی میں آگے جانے کی کوئی بھی کوشش بھاری جانی نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔

---

[14] محصورین چترال کو چھڑانے کے لیے ایک فوج جنرل لو کی قیادت میں پشاور سے بھی نکل چکی تھی ۔ اسے ملاکنڈ سے ہوتے ہوئے لواری پاس کراس کرکے قلعہِ چترال میں محصور میجر رابرٹسن کی زیرِ قیادت فوج کو چھڑانا تھا۔ اس وقت کرنل کیلی کا دستہ شمال سے جبکہ جنرل لو کی فوج جنوب سے مرکزی چترال کی طرف بڑھ رہی تھی۔

عمومی مشاہدے سے یہ میدان بالکل ہموار لگتا تھا مگر حقیقتاً نالے کے آخری کونے میں اُترائی زیادہ تھی بمقابلہ پہاڑی سرے کے، جس کی وجہ سے ان مورچوں سے جو مرکزی راستے پر بنائے گئے تھے، اوپر والا حصہ چھپا ہوا تھا۔ یہ میدان در حقیقت نالے سے آنے والی طغیانی کی لہروں کی طرز پر بنا تھا جس کی وجہ سے متوقع حملہ آوروں کے لیے بہترین دفاع کا کام بھی دے رہا تھا اور حملے کی راہ میں واحد رکاوٹ خود نالہ تھا۔ جیسا کہ تصویر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی عام رکاوٹ نہیں تھی اور ہماری معلومات کے مطابق صرف ان مذکورہ دو راستوں سے ہی پار کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مدعا ایک اور راستہ تلاش کر کے دشمن کے قریب پہنچنا تھا۔

یہی میدانِ جنگ کا کل نقشہ تھا۔ لیفٹیننٹ پیٹر سن اور لیویز میدان تک پہنچ چکے تھے۔ پھر مرکزی دستہ حملے کے لیے تیار ہوتے ہی آگے بڑھنے کے احکامات آئے اور ہم روانہ ہو گئے۔

پیٹر سن اور لیویز دائیں طرف سے حملے کی زد میں تھے۔ جوں ہی باقی دستے پہنچے تو صف بندی ہوئی اور ہم معمول کے انداز سے آگے بڑھنے لگے۔ میدان وسیع ہونے کی وجہ سے روزانہ کی پریڈ کے انداز میں آگے جانے کے لیے بہترین تھا۔ لیویز نجانے کیوں دائیں طرف پہاڑی کے ساتھ چلنے کے بجائے بائیں طرف کو آ کر پیٹر سن کی کمپنی کو حملوں کی زد میں لانے کا سبب بن رہے تھے۔ ان کی یہ حرکت خود انہیں بھی ایک بڑے سنگر سے ہونے والے فائر کے بالکل سامنے لا سکتی تھی۔

چنانچہ کرنل کیلی نے مجھے فوراً وہاں جا کر انہیں دائیں طرف کھسکنے کا حکم پہنچانے کو کہا۔ میں ہمایوں کے گھوڑے پر سوار ہو کر پیٹر سن تک پہنچا اور انہیں دائیں طرف جا کر لیویز سے مزید قریب ہو کر پہاڑی کے ساتھ چلنے کا کہا۔ جس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہماری کمپنی کو آگے بڑھنے کے لیے خالی جگہ مل گئی۔ اب ہماری دو کمپنیاں آگے فائر لائن میں تھیں جبکہ دو ہماری پشت پر مدد پہنچانے کے لیے تھیں اور کشمیر کمپنی اضافی تھی۔ اس پوزیشن میں ہم اس وقت تک آگے بڑھتے رہے جب تک ہم حملوں کی زد میں نہ آ گئے۔ یہاں ہم دوڑ کر نالے سے چار سو گز اوپر پہاڑی پر پہنچے اور پیچھے آنے والوں کے لیے راستہ صاف کیا۔

اب تماشا شروع ہو چکا تھا۔ دشمن میدان کے اوپر والے سنگر سے ہم پر گولہ باری کر رہا تھا جبکہ ہم نیچے والے سنگر کی نظروں سے اوجھل تھے اور ان کو صرف پیٹر سن کی کمپنی نظر آ رہی تھی۔

اسٹیوارٹ اپنی توپ چلانا شروع کر چکا تھا اور وہ سنگر نمبر 16 کو نشانہ بنا رہا تھا۔ ایک عرصے تک پیٹر سن نے مورچوں کو مصروف رکھا جو انہیں مشکل میں ڈال رہے تھے۔

لیویز تین سو گز سے فائر شروع کر چکے تھے اور انہیں دیکھنا کافی مسحور کن تھا۔ ان کی ایک دوسرے کو ہدایات دینے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور وہ نہایت مطمئن تھے۔

ان کا سیکشن کمانڈر لوڈ کرنے کا حکم اپنی زبان میں دے رہا تھا، تاہم فائر کا سگنل "فیر اوولی" تھا اور لفظ "وولی" کے ساتھ بندوقیں چلتی تھیں۔ اگر کوئی سپاہی حکم سے پہلے فائر کرنے کی غلطی دہراتا تو کمانڈر دوڑ کر وہاں پہنچتا اور لیٹ کر فائر کرتے سپاہی کی "تشریف" پر زوردار طریقے سے لات مار دیتا!

اس دوران دشمن کے مورچے کافی حد تک ٹھنڈے پڑ چکے تھے لہٰذا میں نے لیویز کو مزید فائر کرنے سے روکا اور دو بندوں کو لے کر پہاڑی کے ساتھ چلنے لگا تاکہ نالا عبور کرنے کا کوئی راستہ تلاش کیا جاسکے۔ تقریباً کوئی دو سو گز نالے کے اندر کی طرف جانے کے بعد میں نے جوانوں کو مزید آگے جا کر راستہ تلاش کرنے کا کہہ کر خود واپس آ گیا۔

اسٹیوارٹ کی توجہ کسی اور طرف ہوتے ہی مورچوں سے گولہ باری دوبارہ شروع ہوئی۔ لہٰذا کرنل کیلی نے ایک بندہ اسٹیوارٹ کی طرف بھیجا کہ محتاط طریقے سے ایک دو گولے اور داغے جائیں تاکہ مطلوبہ اثرات مرتب ہو سکیں۔

میں نے گامر سنگھ کو لیویز کے لیے گولہ بارود لانے بھیجا اور خود کرنل کیلی کے ساتھ نیچے ایڈوانس گروپ کی طرف آ گیا۔ اسی دوران توپوں کا رخ موڑ دیا گیا اور نیچے موجود سنگر پر گولہ باری شروع کر دی گئی۔ نیچے والے سنگرز کے ساتھ پیٹرسن پہلے ہی برسرِپیکار تھا اور شاید یہی کمپنی تھی جو کافی عرصے سے جان ہتھیلی پر رکھ کر دو بڑے مورچوں کے ساتھ لڑ رہی تھی۔ ہمارے توپچیوں پر بھی فائر کئے گئے اور دو بندے جو توپوں کو کھینچنے والے گھوڑوں کے مالک تھے اور جن کی حفاظت پر چار کشمیری فوجی بھی متعین تھے گولی لگنے سے ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک اور ایڈوانس کمپنی اس وقت تک حملہ کرنے والوں کے ساتھ مل چکی تھی اور اب تین کمپنیاں مل کر دشمن کے ایک سنگر پر لگاتار گولے برسا رہی تھیں۔

اب میں نے کرنل کیلی سے اجازت لی اور ایک بار پھر راستہ تلاش کرنے نکل گیا۔ میں نے لیفٹیننٹ اولڈھم کو اشارہ کیا اور ہم کیپٹن بروڈیل کی کمپنی کو فائر روکنے کا کہہ کر ان کے سامنے سے گزر کر نالے میں اترنے کا کوئی ممکنہ راستہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم کافی آگے نکل کر سنگر نمبر 15 کی فائر رینج میں آ چکے تھے۔ تاہم راستہ ڈھونڈنے میں اب تک ناکام تھے۔ البتہ ہمیں ایک جگہ نالے کی دوسری طرف سے ایک باریک راستہ اوپر کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔ ہم الٹے قدموں واپس آ کر اُسی جگہ پہنچے جہاں سے نیچے اترنے کو ہم تھوڑی دیر پہلے ناممکن قرار دے کر نکل چکے تھے۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے نیچے 70 فٹ گہری کھائی تھی اور وہاں سے نیچے ایک تنگ گھاٹی نکلتی تھی جبکہ دوسری طرف ہم پہلے ہی راستہ ڈھونڈ چکے تھے۔ یہاں سے ہم جلدی واپس آئے تاکہ میں کرنل کیلی کو خبر دے سکوں اور اولڈھم اپنی سیپرز کے ساتھ کوئی حکمت عملی وضع کر سکیں۔ میں نے ریزرو کشمیر کمپنی کو پائنرز کے فائر کور میں راستہ بنتے ہی وہاں سے نیچے اتارنے کی اجازت بھی مانگی اور کرنل کیلی کی منظوری کی بعد لیفٹیننٹ موبرلی کو اپنی کشمیر کمپنی کے ریزرو دستے کو آگے لا کر تیار رہنے کا کہہ کر واپس اُس مقام پر آ گیا جہاں پائنرز حفاظت پر مامور تھے جبکہ اولڈھم کے سیپرز راستہ بنا رہے تھے۔

اس دوران لیویز بھی اوپر پہاڑی کے ساتھ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم نے انہیں پیغام بھیجا کہ ان حالات میں ہمارے کسی بھی نفری کا نالہ پار کرنے سے بہتر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اب میں تقریباً فارغ تھا اسی لیے وہاں بیٹھ کر ارد گرد کے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ سنگر نمبر 16 کافی حد تک

سر دیڑ چکا تھااور اگر وہاں سے کوئی اکادکا فائر ہو بھی جاتے تو ہماری طرف سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی۔ دشمن ایک ایک کر کے بھاگنا جبکہ ہماری طرف سے خوشیاں منانا شروع ہو چکا تھا۔

یہ سنگر اب دشمن کے لیے موت کا پھندا بن چکا تھا۔ وہاں سے بھاگنے کی صورت میں انہیں ایک کھلے ڈھلوان نما جگہ کا انتخاب کرنا تھا جو ہم سے محض چار سو گز کے فاصلے پر ہماری فائر رینج میں تھی۔ نہ بھاگنے پر اوپر سے لیویز والے ان کے سروں تک پہنچنے کی تگ ودو میں مصروف تھے۔ مختصراً خرگوش کے شکار والی کیفیت بن چکی تھی۔ اچانک ایک بندہ سنگر سے نکلتا اور ڈھلوان پر چھلانگیں لگاتا اور کبھی پھسلتا ہوا بھاگ جاتا ہماری طرف سے فائر کرنے کا حکم مل جاتا اور ساتھ کئی گولیاں اس کے آس پاس لگتیں اور غبار اڑاتیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ بندہ بھاگ گیا یا مار گرایا گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد یہی عمل دہرایا جاتا۔ کبھی کبھار ایک ساتھ دو یا تین بندے بھاگنے کی کوشش کرتے اور ہماری طرف سے اُسی معمول میں فائر ہو جاتا۔ کوئی گرتا اور کوئی بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس پورے منظر کے دوران ایک بوڑھا سپاہی میرے قریب ہی لیٹ کر فائر کر رہا تھا اور ساتھ شیخیاں بگھار رہا تھا کہ وہ جو گرتے تھے وہ سب ان کی بندوق اور نشانہ بازی میں مہارت کی وجہ سے تھا۔ اسی دوران سنگر نمبر 16 سے ذرا اوپر چند بندے نمودار ہوئے اور ہم میں سے کسی نے کہا کہ وہ لیویز والے ہیں۔ ہم ان کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ ان میں اسے ایک بندہ اچانک لیٹ گیا اور ہماری طرف گولیاں برسانے لگا۔ لیکن ہماری طرف سے زوردار جواب ملنے پر وہ سب غائب ہو گئے۔

لیفٹیننٹ اولڈھم اپنے سیپرز کے ذریعے اب تک رسیوں اور سیڑھیوں کی مدد سے نیچے ڈھلوان تک پہنچنے کا بندوبست کر چکا تھا۔ موبرلی کو اپنی کمپنی ساتھ لانے کا کہہ کر میں نیچے جانے لگا۔ میرے پیچھے گامر سنگھ، موبرلی اور سیپرز کے ایک دو آدمی تھے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ پوری کمپنی ہمارے پیچھے ہے، رسیوں کے ذریعے نیچے آئے، وہاں سے سیڑھیوں کی مدد سے ایک اور مرحلے میں اور پھر وہاں سے ہاتھ پاؤں مار کر اور کبھی سنگ ریزوں کے اوپر گرتے پھسلتے جلد بازی میں نیچے نالے تک پہنچے۔ وہاں سے ہم نے چڑھائی چڑھنا شروع کیا۔ ہم ہاتھ پاؤں کے بل پر چڑھ رہے تھے کہ دفعتاً اولڈھم جو مجھ سے آگے تھا کہنے لگا کہ ہمارے پیچھے تو کوئی سپاہی ہے ہی نہیں۔ میں نے چیختے ہوئے کہا کہ بھاگ کر کسی سنگر میں چھپتے ہیں اور پھر ہم جان پر کھیل کر اُوپر پہنچے۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھنے لگے وہ کمپنی والے ذلیل ابھی رسیوں سے اُتر رہے تھے اور اُوپر ان کو کور دینے والے پائنرز بھی غائب تھے۔ ان کے پہنچنے پر ہم نے اپنے ساتھیوں کو گننا شروع کیا؛ تین انگریز افیسران، میرے اردلی، 11 سیپرز جن کے پاس کاربن سنائڈرز تھے جبکہ واحد میرے اردلی کے پاس صرف خنجر تھا۔ ہمارے سامنے ایک اونچا ڈھلوان تھا جو آگے والے دشمن کے مورچے سے ہمیں چھپایا ہوا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ اس ڈھلوان تک گئے اور سیپرز کی صف بندی کی۔ اس وقت ہم دیکھ سکے کہ پائنرز دریا کے ساتھ نالے میں اتر رہے تھے اور اوپر سنگر پر لیویز والے قبضہ کر چکے تھے۔ حالات قابو میں دیکھ کر میں نے پیش قدمی کا حکم دیا اور اسی وقت بدقسمتی سے میری چپل ٹوٹ گئی جسے بنانے کا وقت نہ ہونے کی وجہ سے اتار کر بیگ میں ڈال دیا۔ شکر ہے زمین اتنی پتھریلی نہیں تھی اس لیے ننگے پاؤں چلتے ہوئے مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔

جیسے ہی ہم ڈھلوان کے اوپر پہنچے ہم نے دیکھا کہ دشمن کے آدمی جوق در جوق بھاگ رہے تھے۔ ہم سے قریب ترین سنگر کا فاصلہ دو سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ ہم نے منظم طریقے سے ایک ساتھ فائر کھولنے کی کوشش کی تاہم سپیئر اس فن سے مکمل طور پر ناآشنا تھا۔ لٰہذا ہر ایک کو اپنی مرضی سے فائر کرنے کی آزادی دی گئی۔ اس دوران ایک گولی موبرلی کو چھو کر نکل گئی۔ وہ جناب کھڑے ہو کر ہاتھ رانو پر رکھ کر ہدایت دے رہے تھے کہ ایک گولی ان کے ہاتھ کی انگلی کے نچلے حصے سے لگ کر نکل گئی۔

اگرچہ ہمارا قریبی سنگر اب مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا مگر دوسری طرف سے پائنرز تر چھی فائر کر رہے تھے جو ہم نزدیک ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے خوش آئند ہر گز نہیں تھی۔ لٰہذا ہم نے ذرا دائیں کھسک کے آگے بڑھتے ہوئے بھاگنے والوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پتھروں کے درمیان بے ترتیب چل کر جونہی ہم میدان میں آگئے تو صرف پانچ سو گز کے فاصلے پر ہمارے سامنے سے لوگوں کا جم غفیر بھاگ رہا تھا۔ ہم نے ان پر فائر کھول دیئے موبرلی اور میں نے سپاہیوں سے سنائڈر لے لیے۔ جس بندے سے میں نے لیا تھا وہ اُس میں کارتوس پھنسا چکا تھا جس میں اس کی غلطی کم اور ہتھیار کی خستہ حالی کا قصور زیادہ تھا۔ ہم محض پانچ سو گز کے فاصلے پر تھے مگر ہماری موجودگی دشمن کو کوئی خاطر خواہ نقصان نہیں پہنچا سکی۔ اگر اس وقت میرے اپنے رجمنٹ کی ایک کمپنی بھی ساتھ ہوتی تو اسٹیوارٹ بھی ہمارے کارنامے سے مطمئن ہو جاتا۔ بہر حال وہ ہمارے سامنے سے بھاگتے رہے اور ہم بے ضرر گولیاں برساتے رہے اور یوں اس کھیل کا ایک بڑا حصہ اختتام پزیر ہو گیا۔

اس دوران شاہ مرزا آئے اور مجھے ایک پاؤں سے ننگا دیکھ کر اپنے جوتے پیش کئے جو میں نے قبول کیے۔ شاہ مرزا کے لیے ننگے پاؤں چلنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے انہیں لیویز کو بلانے کے لیے بھیجا جو ہتھیار جمع کر رہے تھے اور سنگر میں محصور دشمنوں کو قیدی بنانے میں مصروف تھے۔

اب لیفٹیننٹ کاب بھی چند پائنرز کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں پوری کمپنی بھی آگئی۔ مگر افسوس دشمن تب تک نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ایک کمپنی ان کے تعاقب میں بھیجی گئی۔ کرنل کیلی پہنچ گئے اور ہم نے جنگ جیتنے پر انہیں مبارک باد دی اور سگریٹ کی عمومی فرمائش ہونے لگی۔ موبرلی اس حوالے سے مددگار ثابت ہوا۔

پہلا سوال ہی میں نے کشمیر کمپنی کے بارے میں پوچھا کہ وہ ہمارے اُترنے کے بعد ہمارے پیچھے کیوں نہیں آئی؟۔ اس سوال پر جو بیان کیا گیا وہ یوں تھا۔
"ہم میں سے چند ایک کے چٹان سے نیچے اترنے کے بعد ہی ایک گولی چٹان کے اوپر راستے میں رکھی بارود کے کارٹن کو لگی اور وہاں چنگاریاں پیدا ہو گئیں۔ بورڈیل متوقع دھماکے کا سوچ کر فوج کو پیچھے جانے کا کہتے ہیں اور دشمن اس واقعے کو ہماری فرار تصور کر کے سنگر سے نکل کر حملہ شروع کرتا ہے۔ تاہم ہماری طرف سے شاندار جوابی فائر انہیں واپس پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ اس اثنا میں اوپر سے لیویز اور نیچے سے ہمارا چھوٹا سا دستہ نالے کی دوسری طرف پہنچ جاتا ہے اور یہ سب دیکھ کر دشمن کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔ اور یوں پائنرز کو نیچے مویشیوں کی بنائی پگڈنڈی سے نالہ عبور کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔"

چونکہ پیٹرسن کی کمپنی کو ایک مورچے سے سنائڈر سے بھری ایک صندوق مل گئی تھی اس لیے کشمیر کمپنی کو باقی سنگر کی تلاشی لینے کے بعد انہیں ڈھانے کے مشن پر روانہ کیا گیا۔ اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر میں بھی سنگر کی طرف چلا گیا۔ مجھے سنگر کی ساخت اور بناوٹ پر شدید حیرت ہوئی۔ سنگر کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھر اتنے بڑے تھے کہ انہیں اٹھانے کے لیے کئی آدمی درکار ہوئے ہونگے۔ جونہی میں سب سے بڑے سنگر کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دشمن کا ایک بندہ مقامی کپڑوں میں ملبوس سنگر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا میرے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنی بندوق نکالی مگر اس سے پہلے کہ وہ لوڈ کر لیتا میں نے اسے پستول کے نشانے پر رکھا۔ مجبوراً اُسے ہتھیار ڈالنا پڑا اور اگلے ہی لمحے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ یہ ہمارے ہی لیویز کا وہ بندہ تھا جسے لاسپور میں پکڑ کر دشمن اپنے ساتھ لے جا چکے تھے! دشمن اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا چکا تھا سوائے اس کی بندوق اور چوغا لینے کے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مقامی لباس پہنا ہوا تھا۔ کشمیری فوجی سنگر گرانے میں مصروف تھے کہ میں وہاں سے نکل کر ہمایوں کے پاس پہنچا جو قیدیوں کو ہانک کر آگے جا رہا تھا۔

"ہمایوں" میں نے کہا "تمھارا بندہ وہاں پر ہے"۔ "کیا وہ زندہ ہے؟" ہمایوں نے قیدیوں کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے برجستہ پوچھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ وہ زندہ ہے اور یہ سنتے ہی ہمایوں جھپٹ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر چومنے لگا۔ وہ اتنا پر جوش تھا کہ مجھے خدشہ ہو گیا کہ کہیں وہ میرے ہونٹوں تک نہ پہنچے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اور اکبر خان میدان سے دوڑتے ہوئے سنگر کی طرف گئے اور ان کے پیچھے لیویز والے خوشی سے چیختے چلاتے جا رہے تھے۔

اب توپیں نالے سے لائی جا رہی تھیں اور فوج کو دریا عبور کر کے سنوغر کے گاؤں کی طرف نکلنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا جہاں ہم نے رات گزارنی تھی۔ لیویز کے چند سپاہیوں اور پائنرز کی ایک کمپنی کو علاقہ کلئیر کرنے کے لیے بھیجا گیا جبکہ زخمیوں کو اٹھانے کے انتظامات کے ساتھ سامان لانے کے لیے مستوج کی طرف بھی پیغام بھیجا گیا۔

جنگ ساڑھے بارہ بجے تک ختم ہو چکی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب کچھ صرف دو گھنٹے میں ہو چکا تھا۔ ہمارے چھ بندے مارے گئے تھے جبکہ سولہ زخمی تھے جن میں سے دو اگلے دن چل بسے۔ بیٹری والوں کے تین گھوڑوں کی ہلاکت اس کے علاوہ تھی۔

نیچے دریا تک اترنے کا راستہ مشکل تھا جبکہ دریا کے اوپر جھولنے والا پل بھی خستہ حال تھا۔ چونکہ ہمیں اگلے دن پھر اُسی راستے سے واپس آنا تھا اس لیے جس طرف ہم پہلے ہی سے تھے وہاں ہی دریا کے ساتھ پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔ جلد ہی خیمے نصب کرنے کے لیے جگہ ڈھونڈی گئی اور پہرے لگا کر زخمیوں کو لایا گیا۔

سنو غر والوں کا ایک وفد دریا کی دوسری طرف سے ہماری جانب آرہا تھا۔ وفد کے زیادہ لوگ آدھے ننگے تھے۔ شروع میں ہم نے سوچا کہ شاید یہ ہمارا غلبہ تسلیم کرنے اور خود کو ہماری رعایا جتانے کا کوئی مقامی دستور ہوگا۔ تاہم بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے لیویز والوں نے اُن کے قیدی رہا کرنے کے بدلے ان کے چوغے لیے ہوئے تھے!

اس وفد نے وہی گھسی پٹی روداد سنائی کہ انہیں ہمارے خلاف لڑنے پر مجبور کیا گیا تھا اور یہ کہ وہ ہماری جیت سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ ہمارا جواب بھی حسبِ سابق ایسا ہی تھا کہ خوشی کے اظہار کا بہترین طریقہ بطور قلی ہمارے سامان اٹھانا ہے۔ انہیں زخمیوں کے لیے چارپائیاں مہیا کرنے کا بھی کہا گیا۔ ہمارے پاس اب بھی بارہ قیدی تھے جو سامان اٹھانے کے لیے نہایت مفید تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ چترال پہنچنے تک ہر پکڑے ہوئے بندے سے ہم سامان اٹھانے والے جانوروں جیسا کام ہی لیتے رہے۔ اگر وہ "آدم زادہ" یعنی علاقے کے معززین میں سے کوئی ہوتا تو انہیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سامان اٹھانا پڑتا! یہی ایک وقت ہوتا کہ عام قلی بہت زیادہ خوش ہوتے کہ عام دنوں کے مقابلے میں اِن لوگوں سے سامان اٹھانے کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ قلی ہر دم راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں ہوتے جو کہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ان کے بھاگنے کی کوشش کا بہترین وقت وہی ہوتا جب ہم خیموں میں پہنچ چکے ہوتے اور وہ سامان اُتار کر ایک طرف کو کھسک جاتے۔ یوں ہر پڑاؤ پر کچھ بندے غائب ہو جاتے۔ چونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے سامان بھی کم رہتے جاتے اس لیے ہمیں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی اور ان تمام مشکلات کے باوجود ہم اپنا سامان چترال پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب موبرلی کی مستوج واپسی کے ساتھ ہی ان کے کشمیری دستے کی قیادت میرے ناتواں کاندھوں پر آچکی تھی۔ جس کا مطلب میرے اوپر ذمہ داریوں کا ایک اور بوجھ کا اضافہ تھا۔ شام تک سامانِ رسد پہنچ چکا تھا اور مردوں کو ان کی مذہبی رسومات کے مطابق دفنایا یا جلایا جا چکا تھا۔ زخمیوں کو معروضی حالات میں جتنی بہترین سہولیات دی جا سکتی تھیں دی جا رہی تھیں۔ اولڈھم اور لیویز کا دستہ جو دشمن کے پیچھے گیا تھا واپس آچکا تھا اور رات نو بجے تک ہم رات کا کھانا کھا چکے تھے۔

ہم سونے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ نالے کی طرف پہرے پر لگائے گئے جوانوں نے ایک ساتھ گولیاں برسانا شروع کر دی۔ اولڈھم چند سپاہیوں کو لے کر ان کی طرف گئے اور واپس آکر اطلاع دی کہ پہرہ داروں نے کسی کو نالے کی طرف آتے دیکھا تھا اور شناخت ظاہر کرنے کا کہنے کے باوجود کوئی جواب نہ آنے پر ان پر فائر بھی کھول دیا گیا تھا۔

بابِ ہشتم

قلعہِ دراسن سے ہوتے ہوئے۔۔۔

ہم اگلے دن سورج نکلنے کے بعد اٹھ کر ناشتہ کر چکے تھے اور 7 بجے روانگی کے لیے تیار تھے۔ زخمیوں کو لوارڈ کی قیادت میں سامان لانے والے فوجیوں کی نگرانی میں واپس بھیجا گیا اور ہم مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ ہماری روانگی کی ترتیب ہمیشہ ایک جیسے ہوتی تھی۔ ہر کمپنی اپنی باری پر آگے یا پیچھے ہوتی۔ کرنل کیلی اور کیپٹن بورڈیل کے علاوہ ہر فرنگی افیسر اپنی باری پر ڈیوٹی سرانجام دیتا۔ جب میرا کشمیری دستہ آگے یا پیچھے ہوتا تو میں بھی ان کے ساتھ ہوتا بصورت دیگر وقت اور حالات کے مطابق یا تو کرنل کیلی کے ساتھ چلتا یا لیویز کے۔

اُس دن (14 اپریل کو) ہم کافی عرصے تک نصر گول کی میدانی اور گھاس پھونس والی زمین پر چلتے رہے، پھر اوپر کی طرف گئے اور آخر میں آوی نامی گاؤں کے سامنے بالکل دریا کے کنارے تک آ گئے۔ یہاں ہم چند ساعتوں کے لیے رُکے۔ جوانوں نے پانی پیا جنھیں اس گرم علاقے میں چلنے کی وجہ سے اچھی خاصی پیاس لگی تھی۔ پھر ہماری مخالف سمت میں ایک یا دو گاؤں آ گئے تاہم ہماری طرف کا علاقہ خشک پہاڑوں اور پتھروں پر مشتمل تھا۔ آوی کے مقام پر ایک چھوٹا سا پل تھا وہاں سے لیفٹیننٹ کاب اور شاہ مرزا کو پچاس نفری دے کر بونی نامی اُس گاؤں کی طرف روانہ کیا گیا جہاں کوراغ والے واقعے کے بعد جونز ایک ہفتہ تک رہ چکا تھا۔ وہاں جانے کا مقصد کچھ خوراک حاصل کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے شاہ مرزا مترجم کا کام دے رہا تھا جبکہ مرکزی دستے نے کاب کی پارٹی کے بالمقابل دریا کی دائیں طرف سے سفر جاری رکھا۔

ہمارے وہاں قیام کے دوران دو آدمی گھوڑے لے کر آ گئے جسے کیلی اور بورڈیل نے کافی سراہا۔ جب ہم بونی کے سامنے آ گئے تو آگے والے رک چکے تھے۔ کیلی نے وجہ جاننے کے لیے مجھے بھیجا۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ جب ہم سنوغر میں رکے تھے تو ایک چترالی آدمی دشمن سے جان بچا کر ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ شجاع الملک، وہ نو عمر شہزادہ جنہیں سر جن میجر رابرٹسن چترال کا مہتر نامزد کر چکا تھا اور جو اس وقت چترال قلعے میں رابرٹسن کے ساتھ محصور تھا، کے حامی ہونے کی وجہ سے مصیبتوں میں گھر چکا ہے۔ بدقسمتی سے وہ مخالف پارٹی یعنی شیر افضل کے دودھ شریک بھائی محمد عیسیٰ کے ہتھے چڑھ کر قلعہ دراسن میں قید تھا۔ جنگ کے دن وہ وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوا تھا اور شام کو ہمارے پاس پہنچا تھا۔ ہم نے فوراً سے پیشتر اسے اپنا رہبر بنا لیا۔

اُسی رہبر نے بتایا کہ آگے سڑک تباہ کی گئی ہے اور مرمت کرنے میں دو دن لگیں گے۔ تاہم دائیں طرف ایک ٹیلے پر چڑھ کر ہم سڑک کے ٹوٹے ہوئے حصے کے اُس پار نکل سکتے ہیں۔

اسی وجہ سے آگے چلنے والے رُک چکے تھے۔ لیویز ٹیلے پر چڑھ چکے تھے اور اوپر پہنچ کر سارے علاقے کی خوب جانچ کر کے ہمیں گرین سگنل دے رہے تھے کہ اوپر چڑھنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ یہ خبر پیچھے کرنل کیلی کو بھیجنے کے بعد میں لیویز کے ساتھ شامل ہو گیا جو ابھی دائیں مڑ کر اوپر کی طرف چڑھنا شروع کر چکے تھے۔ ہمایوں نے مجھے گھوڑے کی پیش کش کی جو میں نے بخوشی قبول کی۔ اس وقت میں نے اس پر غور کیا کہ اب ہمارے پاس دو یا تین گھوڑے تھے جو کہ پہلے نہیں تھے۔ اس وقت تو میں نے کچھ نہیں کہا مگر جلد ہی یہ حکم نامہ نکالا گیا کہ تمام مسروقہ گھوڑے بیٹری والوں کو دینے کے بعد دوسرا حق کمشیریٹ والوں کا ہوگا۔ یہ چڑھائی بہت ہی تکلیف دہ تھی۔ میرے خیال میں ہم تقریباً دو ہزار فٹ تک چڑھائی چڑھے۔ چونکہ میرے پاس گھوڑا تھا اس لیے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا تاہم یہ سامان سے لدے قلیوں کے لئے نہایت اذیت ناک ہوا ہوگا۔ اوپر پہنچنے کے بعد کھلے میدان سے جانا نہایت آرام دہ تھا۔

یارخون اور تورکھو وادیوں کے سنگم میں واقع اس میدان میں پہنچ کر میں لیویز کے ساتھ آگے جانے لگا۔ ہم لگ بھگ دو بجے میدان کے دوسرے سرے میں پہنچے۔ یہاں سے دریا کے اس پار قلعہ دراسن ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سے قلعے کا اندرونی حصہ تک نظر آرہا تھا۔ علاقہ بظاہر بے آب و گیاہ تھا اور ایک آدمی قلعے کے دروازے تک جا کر اسے بند پا کر واپس آرہا تھا۔ گاؤں والے پریشان لگ رہے تھے۔ اوپر پہاڑوں میں دو بندے مویشیاں چرا رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں اپنا نقشہ مکمل کرتا کرنل کیلی اور ایڈوانس گارڈ پہنچ چکے تھے۔ تمام فوج کے پہنچنے تک ہم نے یہاں عارضی قیام کیا اور پھر نیچے اُترنے لگے۔ یہاں سے اُترائی بہت زیادہ عمودی نہیں تھی اس لیے نیچے دریا کے دہانے تک پہنچنے میں صرف 20 منٹ لگے۔ لیویز نے چل کر ہی دریا عبور کیا جبکہ میں گھوڑے پر سوار تھا۔ آثار یہ بتا رہے تھے کہ وہاں پر موجود پل کو حال ہی میں گرایا گیا ہے اور بچے کھچے سامان کو پانی میں بہا دیا گیا تھا۔ لیویز جلدی قلعے تک پہنچ گئے اور نہایت ہی تیزی سے لکڑی کے ایک موٹے تنے کی مدد سے مرکزی دروازہ گرا دیا گیا۔ دروازہ گرتے ہی لیویز نے باقاعدہ ڈاکوؤں کا روپ دھار لیا۔ میرے قلعے کے اندر داخل ہونے تک انہوں نے نہ صرف گندم کے ذخیرے کا پتہ لگا لیا تھا بلکہ لوٹ مار بھی جاری تھی۔ میں نے گامر سنگھ کو داخلی دروازے پر سنتری کی ذمہ داری دے دی اور بورڈیل کے پہنچتے ہی ہم دونوں نے گندم کے ذخیرے کا معائنہ کیا جو کہ ہماری کئی ماہ کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ ہم نے لیویز کو پل تعمیر کرنے کے لیے لمبے شہتیر ڈھونڈنے کے کام پر لگا دیا۔ اس وقت تک کوئی کامیابی نہیں ملی جب تک کسی نے برآمدے کی چھت پر لگے لمبے شہتیروں کو نہیں دیکھا۔ ہم نے وہ اُکھاڑ کر تیزی سے نیچے دریا کی طرف بھیج دیئے جس کے اُس پار کافی فاصلے پر ہمارے فوجی دستے رُکے ہوئے تھے۔

پل تعمیر کرنے میں کافی وقت لگا۔ اگرچہ بننے کے بعد بھی یہ جھول رہا تھا تاہم اس کی وجہ سے جوان دریا میں اتر کر پار کرنے کی کوفت سے بچ گئے۔ ایک آدمی دریا میں گر گیا مگر اسے بھی ٹھیک ٹھاک باہر نکالا گیا۔ سامان شام ڈھلنے کے بعد پہنچ گئے اور زیادہ تر قلیوں کو چل کر دریا پار کرنا پڑا کہ اس کمزور پل پر

ایک ایک کر کے گزرنے کا وقت کسی کے پاس نہیں تھا۔ بیٹری والوں کو بھی پائنچے چڑھانے پڑے تاہم اس سے پہلے گدھوں سے سامان اُتارے گئے اور پھر سامان کو دوسری طرف پہنچا کر گدھوں کو تیرنے پر مجبور کیا گیا۔ آخری دستہ پہنچنے اور دریا عبور کرنے تک رات ہو چکی تھی۔ اس دستے کی قیادت لیفٹیننٹ کاب کر رہا تھا جو نو بجے کے قریب قلعہ پہنچ گیا۔ رات ہونے کے بعد چند ایک فائر کیے گئے جس کی زد میں کوئی نہیں آیا اور نہ ہی ان بے تکے فائر کی کوئی معقول وجہ معلوم ہو سکی۔ تمام قلیوں کو قلعے کے اندر برآمدے میں جمع کر کے ان پر پہرے بٹھائے گئے۔ جلد ہی وہاں آگ جلائی گئی جس کے ارد گرد وہ دبکے بیٹھے رہے۔

جتنا گندم ہمیں ملا تھا اسے پورا ساتھ لے جانا ناممکن تھا لہٰذا میں نے اسے قلیوں کے درمیان تقسیم کرنے کی اجازت مانگ لی۔ گامر سنگھ کی جگہ مقیم چوکیدار کو میں نے قلیوں کو ایک ایک کر کے اندر بھیجنے کی ہدایت دی۔ اسی دوران باہر سے قلیوں کو مال مویشیوں کی طرح ہانک کر ایک لائن میں دروازے تک لایا گیا۔ آٹا چھ فٹ چوڑے اور چار فٹ گہرے صندوق نما کوٹھری/خندق میں چھپایا گیا تھا جس تک پہنچنے کا سوراخ بہت ہی چھوٹا تھا۔ اس ذخیرے کا سوراخ وسیع کر کے ایک بندے کو لکڑی سے بنا بیلچہ دے کر اندر اُتارا گیا۔ قلی دروازے سے داخل ہو کر جھولی بھر کر آٹا لیتے اور اس ذخیرے کے گرد گھومتے ہوئے دوسری طرف سے نکل جاتے۔ یوں سب کو آٹا ملنے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ اس کے باوجود آٹے کی مقدار میں کوئی خاطر خواہ کمی نظر نہیں آئی جب کہ غلے کے کئی صندوقوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا تھا۔ میں اسٹور کی نگرانی پر چوکیدار مامور کر کے باہر نکلا تو کاب اور پیچھے رہنے والے دستے بھی پہنچ چکے تھے رات کا کھانا تیار تھا اور بارش شروع ہو چکی تھی۔

ہم قلعے کے سامنے خیمہ زن ہوئے۔ ہمارے جوان میدان میں جبکہ ہم ایک عبادت خانے کے ساتھ ہی دریا کو نظروں کے سامنے رکھ کر سو گئے۔ لیویز ہمارے دائیں طرف سو گئے جبکہ اسلحہ اور سامانِ رسد کو کوارٹر گارڈ میں رکھا گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ تمام قلیوں کو قلعے کے اندر بند کر کے ان پر چوکیدار بٹھایا گیا تھا۔

صبح سویرے زوردار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے اپنا بستر قلعے کی راہداری کی طرف کھینچ لیا جہاں اسٹیوارٹ اور اولڈھم پہلے ہی بہترین جگہوں پر قابض ہو چکے تھے۔ مجھے دو لیویز کے درمیان جگہ مل گئی اور باقی ماندہ رات سکون سے گزر گئی۔ ہمارا دن بھی کچھ زیادہ برا نہیں گزرا تھا۔ ہم نے دشوار گزار پہاڑوں میں تقریباً بیس میل کا فاصلہ صبح سات سے شام چھ تک چل کر طے کیا تھا۔ راستے میں ایک پل بھی تعمیر کیا اور اس ملک کے ایک بہت بڑے قلعے پر قبضہ کیا۔ صرف کاب ہی تھا جس نے پچھلے دستوں کے ساتھ مشکل حالات کا سامنا کیا مگر اس کے کھاتے میں بونی پر چڑھائی کرنے کا اطمینان بخش کارنامہ موجود تھا۔

(15 اپریل کی) صبح اٹھے تو گہرے کالے بادل اور تواتر کے ساتھ بارش ہماری منتظر تھی۔ ہر چیز ابتر حالت میں تھی اور بے چارہ خانساماں گیلی لکڑیوں کو جلانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اس دن ہمارا سفر مختصر تھا اس لیے ہم صبح آٹھ بجے قلعے سے نکلے۔ بلکہ ہم نکل ہی رہے تھے کہ کشمیر رجمنٹ کا ایک

سپاہی جو ایڈورڈز کے ساتھ تھا اندر داخل ہوا۔ انہیں ایک مقامی شخص نے پناہ دے کر چترالی کپڑے دیئے تھے۔ انہیں واپس چترال ہمارے ساتھ چلنے کا حکم مل گیا اور آٹا فوجیوں میں تقسیم کرنے کے ساتھ جتنا ہم اٹھا سکتے تھے اٹھا کر چل پڑے اگرچہ وہ ہماری ضرورت سے کہیں کم تھا۔

پونیال لیویز کا ایک چھوٹا سا دستہ اس دن ہمارے ساتھ مل گیا جو ہمارے قیامِ مستوج کے دوران جانوروں کے لیے چارہ ڈھونڈنے یارخون گیا تھا۔ ہمارا راستہ باغات اور مکئی کی فصلوں کے درمیان تھا جو بے تحاشا بارش کے باوجود خوبصورت اور سرسبز لگ رہا تھا۔ بہار کی ابتدا تھی۔ پودے سرسبز ہو رہے تھے جبکہ کھیتوں میں فصلیں لہلا رہی تھیں۔ خوبانی اور ناشپاتی کے درختوں پر پھول لگ چکے تھے۔ ہمیں دراسن سے نکل کر راستے میں کوئی ذیِ روح نظر نہیں آیا تاہم ہمارے بعد آنے والے بتا رہے تھے کہ ہمارے نکلتے ہی اوپر پہاڑوں سے لوگ جوق در جوق واپس قلعے کی طرف آ رہے تھے۔

اگلے پڑاؤ تک پہنچنے سے پہلے ہم نے اوپر چڑھائی کی اور ایک ڈھلوان پر پہنچ گئے۔ یہاں کئی چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ اور ہر ہموار قطعہ زمین کاشت کیا ہوا تھا۔ ایسی ہی ایک ڈھلوان نما جگہ کو ہم نے کیمپ کے لیے منتخب کیا۔ یہاں پر تین گھر اس طرح بنے تھے کہ تکون ہونے کا گمان ہو رہا تھا اور اس تکون کے درمیان ایک سرسبز و شاداب کھیت تھا۔ ہم نے کھیت میں خیمے لگائے اور سپاہوں کو تینوں گھروں میں ایسے رکھا کہ وہ ایک دوسرے پر آنے والے کسی بھی خطرے کا مل کر مقابلہ کر سکتے تھے۔ ہم نے اس گاؤں کوشٹ کے سربراہ رسول کے گھر کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ یہ بندہ مہتر نظام الملک کا رضاعی باپ تھا لیکن بعد کے حالات میں باغی ہو کر شیر افضل کے ساتھ شامل ہوا تھا۔

وہسکی کا نہایت شوقین یہ شخص میرے گزشتہ دورۂ چترال کے دوران میرا بہت ہی عزیز دوست بن گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے اپنے گھر قیام کا سن کر اسے خوشی ہوئی ہو گی تاہم میں اس کا 'شکریہ' تک ادا نہیں کر سکا کیونکہ وہ ہمارے پہنچنے سے چند ساعت پہلے وہ چترال کی طرف نکل چکا تھا۔ اس کا گھر چترال میں میرے دیکھے ہوئے تمام مکانات سے خوبصورت تھا۔ خوبصورت ترشے ہوئے پتھروں سے مزین صحن کے تینوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے جبکہ چوتھی طرف صدر دروازے کے ساتھ ایک بوڑھا چنار ماضی کی کئی یادیں سینے میں سجائے کھڑا تھا۔ کمرے کشادہ تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مجھ سمیت پائنرز پارٹی کی دو کمپنیاں اس مکان میں آسانی سے سما گئی تھیں۔

تین بجے تک ہم پر سکون ہو چکے تھے اور ہمارے کپڑے بھی سوکھ گئے تھے۔ لیویز جانوروں کے لیے چارہ لینے گئے اور ساتھ مزید کئی گھوڑے لے آئے۔ لمبے سفر کے بعد اسٹاک کی کمی اور مزید گھوڑوں کی آمد کی وجہ سے ہمیں سواری کے لیے بھی گھوڑے ملنے لگے اور جب ہم چترال میں داخل ہو رہے تھے تو تقریباً ہم سب گھوڑوں کی پشت پر تھے۔ لیکن چترال پہنچنے کے دس دنوں کے اندر گھوڑے کے مالکان نمودار ہونا شروع ہو گئے اور ہمیں گھوڑے واپس کرنے کے احکامات مل گئے جو بادل نخواستہ تسلیم کرنے پڑے۔ بہر حال شام ہونے سے پہلے کیمپ میں ہونا اور پر سکون ہونا خوش آئند تھا۔ قلیوں کے لیے تو یہ بات یقیناً اور بھی زیادہ قابل مسرت ہو گی۔ اس پڑاؤ کے دوران سب سے بڑا مسئلہ خوراک کا پیش آیا۔ جس آٹے سے ہم چپاتی بنا رہے تھے وہ

نہایت موٹا ہونے کے ساتھ اس میں بھوسے کی آمیزش بھی تھی جس وجہ سے اسے کھانا اور ہضم کرنا ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک کپڑے پر آٹے کو چھانٹا تو جو برآمد ہوا وہ ناقابلِ یقین انکشاف تھا۔

ہمیں اگلی صبح (16 اپریل) سات بجے نکلنا اور اگلے پڑاؤ یعنی پرپیش پہنچنا تھا۔ صبح بارش کی وجہ سے ہم دس بجے تک وہاں ٹھہرے رہے۔ اس دن ہراول دستہ کشمیر رجمنٹ پر مشتمل تھا سو میں ان کے ساتھ چل نکلا۔ لیویز کے دو سپاہی آدھے میل کے فاصلے پر ہم سے آگے چل رہے تھے اور تقریباً دو میل چلنے کے بعد ہم ایک چوٹی پر پہنچ گئے جہاں سے نیچے کا نظارہ نہایت ہی شاندار تھا۔ ایک جگہ رُکنے کے دوران کرنل کیلی ساتھ مل گئے اور میں نے انہیں کوراغ کی وہ پہاڑی دکھائی جہاں روز کی پارٹی پر حملہ ہوا تھا، گاؤں ریشن جہاں ایڈورڈز اور فولر کو ایک ہفتے تک قید کیا گیا تھا، گاؤں برنس جہاں ہم اگلے دن پہنچ رہے تھے، یہ سب جگہیں کرنل کیلی نے دیکھ لیں۔ یہ سب گاؤں دریا کے اُس پار ہمارے قدموں سے کئی ہزار فٹ نیچے تھے۔ ہم نے موجودہ راستے کا انتخاب کر کے نہ صرف ایک نہایت مشکل اور خطرناک راستے سے جان چھڑا لیا تھا بلکہ دوسری طرف کی وادیوں کے مکینوں سے بھی جن سے ہمیں شدید نفرت تھی، جو پرانے راستے پر چلتے ہوئے سارے کام اپنے طریقے پر کر ڈالتے۔

تقریباً دو بجے ہم گہکیر (مصنف نے نام گورکا لکھا ہے) نامی گاؤں پہنچے جہاں گاؤں کا ایک نمائندہ وفد ملنے آیا۔ ہم نے انہیں کڑی سزا سے بچنے کا طریقہ کچھ خوراک ہمارے کیمپ تک پہنچانا بتا کر وہاں سے نکلے اور تقریباً چار بجے ایک چھوٹے سے گاؤں لون پہنچ گئے۔ بہترین لوکیشن، جلانے کی لکڑیوں کی فروانی اور پانی کی موجودگی نے کرنل کیلی کو یہاں کیمپ لگانے پر آگسانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہمایوں کی معلومات کے مطابق یہاں کی آبادی کافی تھی لہٰذا گاؤں والوں کو بھاری خوراک لانے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ لون والوں نے ہماری قربت کی وجہ سے دل کھول کر مدد کی جبکہ گہکیر والوں کی طرف سے حقیر سی سپلائی اگلی صبح پہنچ گئی۔ نتیجتاً لیویز کا ایک دستہ واپس گہکیر کی طرف روانہ کیا گیا اور اب کی بار گہکیر والوں کو نہ صرف بھاری سامان اٹھا کر برنس تک لے جانے کی مشقت سے گزرنا پڑا بلکہ گاؤں کے سربراہ کو اسلحوں کا بکسہ اٹھا کر چترال تک ساتھ ہمارے ساتھ چلنا پڑا۔

شام ہونے سے پہلے سورج نے اپنا دیدار کروایا اور کیمپ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں کیمپنگ پر سکون، جگہ کشادہ اور رات کم سرد تھی۔

بابِ نہم

چترال کے قریب

اگلے دن یعنی 17 اپریل کو ہم علی الصبح ہی روانہ ہو گئے۔ رات دو قیدی پکڑ کر لائے گئے تھے جن سے ہتھیار بھی بر آمد ہوئے اور جنہوں نے نصر گول جنگ میں ہمارے خلاف لڑنے کا اعتراف بھی کر لیا۔ ہم نے انہیں دوسرے طریقے سے سزا دینے کا فیصلہ کیا اور اسلحہ کے صندوق اٹھا کر ہمارے ساتھ چترال لے جانے کا کہا۔ ان میں سے ایک نے جس کے پاس سنائڈر بندوق تھی، خود کو مولوی بتا کر ساتھ چلنے سے انکار کیا مگر اس کی توجیہ کو نامعقول قرار دے کر مسترد کیا گیا۔ ہم نے اسلحہ اٹھانے کی ذمہ داری ان مشکوک لوگوں کو دی تاکہ وہ ہر وقت ہمارے گارڈز کی نظروں کے سامنے رہیں اور ان کا سامان بھی زیادہ بھاری اور لے جانے کے لیے آٹے کی بوری سے زیادہ مشکل ہو۔

اب ہم پہاڑی سے نیچے دریا کے کنارے کی طرف رواں دواں تھے۔ اس وقت میں آخری دستوں کے ہمراہ تھا جو کہ ہمیشہ مشکل ہوتا ہے، خاص کر اُس وقت جب آگے جانے والے کسی مشکل کی وجہ سے رک جائیں تو ہمیں خاصے وقت تک صرف یہ پتہ لگانے کی دشواری ہوتی تھی کہ ہوا کیا ہے اور کارواں آگے کیوں نہیں بڑھ رہا۔ آج کا دن رُک رُک کر چلنے کے حوالے سے بد ترین تھا۔ پہلی مشکل اس وقت پیش آئی جب ہم پر پیش نالہ پہنچے۔ یہ جگہ نصر گول جیسی ہی تھی مگر اس کے دفاع پر کوئی دشمن مامور نہیں تھا۔ تقریباً دو میل آگے راستہ ایک پہاڑی سے گزرتا تھا جسے گرایا گیا تھا کم و بیش تین گھنٹے کی مشقت کے بعد راستہ ٹھیک کیا گیا۔ راستہ اتنا خطرناک تھا کہ مرمت کے باجود ہمارے دو گدھے گر گئے تاہم ایک زندہ اور آگے سفر جاری رکھنے کے قابل رہا۔

اس دن اور آگے بھی ہم نے دریا کے ساتھ جا بجا بہتی لاشیں دیکھیں جو شاید روز کے ساتھ مرنے والے سکھ تھے یا پھر ایڈورڈز کی پارٹی کے سپاہی۔

تقریباً چار بجے آخری دستے نے اس پہاڑی کو عبور کیا اور لمبا چکر کاٹ کر ہم ایک چھوٹے سے بیابان میں آ گئے جو چند جنگلی جڑی بوٹیوں کے سوا کسی بھی قسم کے سبزے سے خالی تھا۔ ہم نے یہ ایک میل کا فاصلہ طے کیا اور پھر نیچے دریا کی طرف اترنا شروع کیا۔ یہاں سے ہم نے آگے جانے والوں کو دیکھا جو دریا عبور کر کے دوسری طرف چڑھائی چڑھ رہے تھے۔

چونکہ یہاں سے چند میل آگے دریا کی دائیں طرف والا راستہ پھر سے خراب کیا گیا تھا اس لیے آگے چلنے والے دستے برنس میں پڑاؤ ڈالنے کے ارادے سے ایک مناسب جگہ دیکھ کر دریا پار کر رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے تک مرکزی دستہ وہاں سے نکل کر برنس گاؤں کی طرف جا رہا تھا جبکہ لیویز کو سامان اور قلیوں کو دریا پار کرانے میں مدد کرنے کے لیے ادھر چھوڑا گیا تھا یہ تدبیر یقیناً کئی لوگوں کو ڈوبنے سے بچانے کا سبب بنی۔

میں نے بہت سارے قُلیوں کو ابھی تک دریا کے دائیں طرف پایا جو نہایت آرام کے ساتھ دوسری طرف جانے کی تیاریوں میں لگے تھے کچھ لوگ قمیص اتار رہے تھے اور کچھ پائنچے چڑھانے میں مصروف تھے۔ چونکہ پانی کافی گہرا تھا اس لیے سامان سروں پر رکھ کر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جوق در

جوق در یامیں اتر رہے تھے۔ جن کے پاس سامان بھاری تھا انہیں دو حصوں میں تقسیم کر کے لے جانے کا کہا گیا۔ یہ طریقہ نہایت اچھا لگا لیکن کچھ دیر بعد ہی ہمیں احساس ہوا کہ قلی یہاں سے دوسری طرف جا کر آرام سے اپنے کپڑے پہن کر وہی آدھے سامان اٹھائے اوپر چڑھنے لگے تھے۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ سرجنٹ ریویز (Reeves) دوسری طرف تھے میں نے دریا پار کیا اور قلیوں کو جبراً اس وقت تک واپس بھیجنا شروع کیا جب تک پورا سامان دوسری طرف نہ لایا گیا۔

اس سارے عمل میں تقریباً تین گھنٹے لگے۔ اس دوران کچھ دلچسپ واقعات بھی پیش آئے۔ دریا کا بہاؤ تیز ہونے کی وجہ سے قلی درجن بھر کی تعداد میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دریا میں اتر جاتے اور ایک دوسرے کو ڈوبنے سے بچا کر دوسری طرف پہنچا دیتے۔ زیادہ جوان قلی ادھیڑ عمر والوں کو نہ صرف دریا پار کرنے میں مدد کر رہے تھے بلکہ جب کوئی بڑھا قلی سامان تقسیم کر کے لاتا اور اسے دوبارہ پار جانے کا کہا جاتا تو کوئی بھی نوجوان قلی رضاکارانہ طور اس کا سامان لانے کی درخواست کرتا جو ہم بخوشی قبول کرتے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ نوجوان باآسانی قابو ہوتے تھے اور بوڑھے معمولی سی سرزنش پر تابعداری کرتے جبکہ درمیانی عمر کے قلی زیادہ باغیانہ فطرت کے تھے وہ واپس جانے اور دوسری طرف سے سامان لانے پر عموماً احتجاج کر رہے تھے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ان سے 'مذاکرات' ہم نے بندوق کے دستے مار کر کیے اور یوں وہ بھی احکامات بجالانے لگے۔ آخری دستہ دریا پار کرنے تک رات گہری ہو چکی تھی۔ تقریباً نو بجے میں کیمپ پہنچ کر کیلی کو رپورٹ کر چکا تھا کہ تمام اسباب مع قلیوں کے کیمپ پہنچ چکا ہے۔

میں رات گئے تک نہیں سو سکا کیوں کہ اس رات کیمپ کے گارڈز کی نگرانی میرے ذمے تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ رات کے آخری پہر تک کچھ لوگ کھانا ہی بنا رہے تھے جو کہ شاید اگلے دن کی تیاری تھی۔

جیسا کہ ہمارے سامان کم رہ گئے تھے جو شاید اگلے تین دنوں کے لیے کافی نہیں تھے اس لیے ہم نے صبح دس بجے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ وجہ یہی تھی کہ کچھ لوگ صبح سویرے جانوروں کے لیے چارے کی غرض سے گاؤں کی تلاشی لیں گے۔ اسی دوران لیویز کے کچھ اہلکاروں کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے اگلے گاؤں تک بھیجا گیا۔

چارے کی تلاش میں گئے ہوئے لوگوں کے ہاتھ کچھ خاص نہیں لگا تا ہم جتنا تھا اس پر خوش ہو کر ہم نے رختِ سفر باندھ لیا۔ برنس نالہ عبور کرتے ہی آگے گئے ہوئے ہمارے سپاہی واپس آتے ہوئے ہم سے مل گئے جنہوں نے بتایا کہ دشمن کے تقریباً سو پیادہ اور بیس گھڑ سوار دستے مروئے (مصنف نے مروئے کا نام غلطی سے موری لکھا ہے اور تواتر سے لکھا ہے) کے مقام پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ جنگ کی ہلکی سی امید پر ہم بھی کافی خوش ہوئے!

اب راستہ پھر نیچے دریا کی طرف جا رہا تھا جس کے اوپر تقریباً تین چار سو فٹ بالکل ہی عمودی پہاڑی ایستادہ تھی۔ یہ راستہ تقریباً ایک کا میل تھا اور وہاں سے آگے پھر دو میل تنگ راستہ اور اوپر چھوٹے بڑے ڈھلوان اور پہاڑیاں تھیں۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ نہایت ہی خطرناک تھا اور یہاں دشمن کے ہاتھ لگنے کی صورت میں بھاری نقصان کا اندیشہ تھا۔

مگر کرنل کیلی دشمن کے ہاتھ لگنے والوں میں سے نہیں تھا۔اس لیے ایک ایڈوانس پارٹی ترتیب دے کر انہیں آگے جانے کا کہا گیا۔انہیں ہدایت دی گئی کہ وہ اس پار میدان میں جا کر قابض ہونے کے بعد ہمیں مطلع کریں تو ہی ہم مرکزی دستے اور توپوں کو آگے لے جائیں گے۔ آدھے راستے کے بعد ایڈوانس پارٹی نے راستے کو ٹوٹا پایا مگر اس کی جلد ہی مرمت کی گئی۔ وہاں سے نکل کر پہاڑی کے نیچے تقریباً 50 گز چوڑے میدان میں پہنچ کر ایڈوانس پارٹی کو لگا کہ وہ مذکورہ میدان میں آچکی ہے لہٰذا انہوں نے ہماری طرف پیغام بھیجا اور ایک چھوٹے دستے کو اوپر پہرے پر بٹھا کر ہم روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچنے پر ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایک عمودی پہاڑ کے بالکل نیچے نہایت ہی خطرناک جگہ پر ہیں اور یہاں راستہ پھر اوپر چڑھ کر ایک ڈھلوان سے ہوتا ہوا اس میدان میں پہنچتا ہے جو ہمارا اصل ہدف تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے افراتفری والی کیفیت رہی تاہم وہاں سے نکل کر آگے میدان تک پہنچنے میں ہماری خوش قسمتی کا بڑا ہاتھ تھا۔

میدان سے جب ہم روانہ ہوئے تو میں آگے دستوں کے ساتھ شامل ہوا۔ تھوڑا آگے جانے پر ہمیں لیویز کا پیشرو دستہ ملا جن کے ساتھ مروئے کے دو باشندے بھی تھے۔ مروئے یہاں سے دو میل کے فاصلے پر تھا اور یہ وہ جگہ تھی جہاں اطلاعات کے مطابق دشمن کی فوج ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

ان دو بندوں نے بتایا کہ ہمارا حریف محمد عیسیٰ[15] اپنے ساتھیوں سمیت صبح سات بجے کوغذِی کی طرف نکل چکا ہے اور اسی گاؤں کے عین داخلے پر گولین گول کے مقام پر اپنا دفاع کرے گا۔ اب میں لیویز کے ساتھ آگے کی طرف روانہ ہوا اور ہم گاؤں سے نکل کر کھلے مقام پر آ گئے اور دشمن کو نہ پا کر مطمئن ہو گئے۔

میں نے لیویز کو گاؤں کا چپہ چپہ چھان مارنے اور سامان جمع کرنے پر لگا کر خود پڑاؤ ڈالنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔ یہ کام نہایت آسانی سے ہوا اور میں جلد ہی پھلدار پودوں سے لدے ایک خوبصورت باغ تلاش کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس بڑے میدان میں توت کے بڑے بڑے درختوں کے علاوہ درمیان سے بہنے والے پانی کی موجودگی اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ باغ کی ایک طرف وہ مکان تھا جس میں محمد عیسیٰ قیام کر رہا تھا اور یہ شیر افضل کے بااثر حامی کا نہایت خوبصورتی سے تعمیر شدہ مکان تھا۔

چارے کی تلاش والی پارٹی کو اپنے کام پر لگا دیا گیا اور گاؤں کے وہ باشندے جو ہم سے مل کر اپنے ساتھیوں کو لانے کا وعدہ کر چکے تھے تقریباً دس بندوں کے ساتھ آدھے آدھے تھیلے آٹے اٹھائے آ گئے۔ یہ سب اور جو کچھ چارے کی تلاش میں جانے والے لے کر آئے تھے ملا کر اتنا بن چکا تھا کہ ہم باآسانی تین دن گزار سکتے تھے اور تب تک ہم اپنی منزل تک پہنچ جاتے۔ ہمیں کافی تعداد میں چاول اور باجرہ بھی ملا تھا۔ دونوں خام حالت میں تھے۔ ہم پن چکیوں

---

[15] اوجنوتور کھو کے بائیکے برادری سے تعلق رکھنے والے، مہتر شیر افضل کے رضاعی بھائی محمد عیسیٰ چترال کی روایتی داستانوں میں 'مہت عیسیٰ پہلوان' کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ہی تھے جس نے 14 مارچ 1895 کو ریشن میں اپنے دست راست پہلوان دانیال بیگ (شالی، چترال) کے ساتھ مل کر لیفٹیننٹ ایڈورڈز اور لیفٹیننٹ فولر کو قیدی بنایا تھا۔

تک تو پہنچے مگر وہ ساری خراب حالت میں تھیں اس لیے ہر کوئی پتھروں کی مدد سے پیس کر اپنے کھانے کے قابل بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ہمارے پاس کچھ بھیڑ بکریاں بھی تھیں جو تب ہی کاٹی جاتیں جب سب کو ملنا ممکن ہو جاتا۔

آخری دستہ پانچ بجے پہنچ گیا اور یہ مستوج سے نکلنے کے بعد پہلی بار ہو رہا تھا کہ یہ لوگ رات ڈھلنے سے پہلے کیمپ پہنچ رہے تھے۔ اس لیے ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔

موری میں پل کو جلا دیا گیا تھا۔ لیکن ہم نے تقریباً دو میل آگے ایک اور پل کا سن رکھا تھا۔ جسے گرانے کی صورت میں بھی باآسانی مرمت کیا جا سکتا تھا اور وہاں سے آگے دشمن کے پڑاؤ پر نظر بھی رکھا جا سکتا تھا۔

نتیجتاً (19 اپریل کی) صبح سویرے اولڈھم اور ان کے سیپئرز، لیفٹیننٹ بیتھون کی قیادت میں ایک محافظ دستے اور لیویز کی زیر نگرانی پل کی مرمت شروع کر چکے تھے۔ ہم ایک گھنٹہ بعد نکلے۔ گو کہ جگہ جگہ راستہ خراب کیا جا چکا تھا مگر ہراوّل دستہ والے اسے باآسانی مرمت کرتے گئے اور ہم دس بجے تک اس جگہ پہنچے جہاں اولڈھم کی ٹیم پل کی مرمت پر لگی ہوئی تھی۔

مسئلہ پل کے شہتیروں کا تھا جو دریا کے اس پار ایک چھوٹے سے گاؤں میں تلاش کیے جا رہے تھے۔

پل تیار ہونے میں دو گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ درکار تھا اس لیے کیلی نے مجھے گولین گول میں موجود دشمن کا جائزہ لینے کے لیے آگے بھیج دیا۔ تقریباً آدھے میل پر مجھے تباہ کردہ پل کا شہتیر مل گیا میں نے پیچھے خبر بھیج دی اور آگے روانہ ہو گیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد پہلے سے جائزہ کے لیے نکلے ہوئے لیویز مل گئے۔ جہاں دشمن ہو سکتا تھا وہاں ہمیں کچھ نظر نہیں آیا سو ہم مزید آگے جانے لگے۔ ہم گولین گول پہنچ گئے جو ایک تیز بہتے ہوئے نالے اور اونچی پہاڑی پر مبنی علاقے کا نام تھا۔ یہ نالہ یہاں دریائے یارخون میں شامل ہوتا تھا اور نالے کو عبور کرنے کا واحد پل تباہ کر دیا گیا تھا۔ میں نے چند لیویز کو پانی کا پایاب حصہ تلاش کر کے پار کرنے کے لیے نیچے بھیجا تاکہ وہ اس پار جا کر نگرانی کر سکیں۔ میں نے ایک قاصد کرنل کیلی کی طرف بھیجا جو پیغام ملتے ہی اُس پل پر کام چھوڑ کر ہماری طرف نکل گئے کیونکہ اب ہمیں اُس پل کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ہم نے گولین گول پل کی شہتیروں کی تلاش شروع کی جو کہ ہمیں نالے کے ساتھ تھوڑا آگے مل گئیں۔ چار میں سے صرف ایک مکمل طور پر برباد کیا جا چکا تھا۔ یہ تین شہتیر ڈال کر اور قریب کے ایک مکان سے تختے اور آس پاس سے درخت کی شاخیں اور جھاڑیاں لا کر پل تیار کیا گیا۔ نالے کے پار کوغذی کی طرف خالی مورچے تھے جنھیں ڈھا کر ہم یہاں سے قریباً ایک میل آگے کوغذی گاؤں میں داخل ہو گئے۔

ہم نے حسبِ معمول پورا گاؤں چھان مارا اور ہمیں ایک ہی بندہ ملا جو گلگتی تھا اور کئی سال پہلے غلام بنا کر لایا گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ یہاں مقیم تھا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مہت عیسیٰ (محمد عیسیٰ) اپنے سو کے قریب ساتھیوں سمیت ایک دن پہلے پہنچا تھا مگر شیر افضل کی طرف سے جلد از جلد چترال پہنچنے کا پیغام ملتے ہی چار بجے سہ پہر یہاں سے چترال چلا گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سارے گاؤں والے اوپر گولین گول جا چکے ہیں اور گاؤں خالی ہے۔ ان کا خیال

تھا کہ دشمن اب مزید مقابلہ نہیں کرے گا باجود اس کے کہ چترال میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں کار بیتیر ڑی نامی جنگی حوالے سے نہایت خطرناک پہاڑی سے گزرنا باقی تھا۔ اس نے خود سے جا کر کار بیتیر ڑی کی گھاٹی کا جائزہ لے کر خبر لانے کی پیش کش کی جسے ہم نے قبول کیا۔ مجھے اس جگہ کا پتہ تھا اور ساتھ یہ بھی پتہ تھا کہ خطرہ ہونے کی صورت میں کوغذی میں دریا پار کر کے ہم دوسری طرف سے پہاڑی چڑھ کر نکل سکتے تھے۔ یہ اس حوالے سے بھی اچھا تھا کہ چترال کا پل گرانے کی صورت میں ہم وہاں سے دو میل اوپر دریا پاپیادہ پار کر کے باآسانی قلعہ چترال تک پہنچ سکتے تھے۔

بابِ دہم

منزل

کوغذی میں ہمیں موری (مروئے[16]) سے بھی بہتر جگہ مل گئی۔ مرکزی دستہ آنے تک دو بج چکے تھے، تب تک میں اور راجہ اکبر خان چپ چاپ چپاتیاں توڑتے رہے۔ خوراک جمع کرنے والی پارٹی کو گاؤں کی طرف بھیجا گیا اور اولڈ ھم کو آگے متوقع پل کی جگہ کا معائنہ کرنے کو کہا گیا۔ انہوں نے مثبت رپورٹ دی اور مذکورہ جگہ پر گارڈ تعینات کر دیئے گئے۔

اسی اثنا میں اسٹیوارٹ آگ بگولہ ہو کر داخل ہو گیا وہ دشوار گزار پہاڑوں سے بلاضرورت توپ کھینچ کر لانے پر نالاں تھا اور کہہ رہا تھا کہ بھلا یہ بھی کوئی جنگ ہے۔ ہم دشمن کی تلاش میں کہاں سے کہاں آئے اور وہ سامنے ہی نہیں آتا۔ یہ کوئی جنگ نہیں بلکہ صرف فوجی مارچ ہے بس فوجی مارچ۔

ہم نے انہیں اگلے دن کی متوقع جنگ کا بتا کر تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ چترالیوں سے نااُمید ہو چکا تھا وہ اٹھا اور اپنے گھوڑے کے لیے چارہ تلاش کرنے لگا۔ بے چارے اسٹیوارٹ کو توپ استعمال نہ کر سکنے کا دلی افسوس تھا۔ جوں ہی کیمپ کے انتظامات مکمل ہوئے اور حالات پر سکون ہو گئے تو کرنل کیلی کو ایک خط لے کر چترال جانے کے لیے ایک ہرکارے کی ضرورت پڑ گئی۔ وہ قلعے کو محصور کرنے والوں کو اپنی آمد اور ان کی تباہی سے خبر دار کرنا چاہتے تھے۔ شاہ مرزا سے بات کرنے کے بعد قلعہِ دراسن سے مفرور بندے سے بات کی گئی مگر وہ راضی نہ ہوا۔ گو کہ شاہ مرزا خود ایلچی بننے کے لیے تیار تھا لیکن ہمیں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔ ہم ایلچی ڈھونڈنے میں مصروف ہی تھے کہ ہمایوں اور اکبر چترال سے خط لے کر آنے والے ایک بندے کو لے کر نمودار ہو گئے۔ لفافے کے اوپر 'گلگت سے آنے والی فوج کے سربراہ کے نام' لکھا ہوا تھا۔ کھولا تو خط میں چترال کے قلعے میں محصور انگریز فوج کے سربراہ سرجن میجر رابرٹسن نے 18 اپریل کی رات شیر افضل کا محاصرہ ختم کر کے بھاگنے کی اطلاع دی تھی۔ ساتھ زخمیوں اور مقتولین کی ایک فہرست بھی تھی جسے وہ ہندوستان بھیجنا چاہتے تھے۔ ہم نے فہرست دیکھی اور بے چارے کیپٹن بیرڈ کی موت کا پتہ چلا۔ اس سے پہلے ایسی کوئی خبر ہمارے پاس نہیں پہنچی تھی جبکہ مقامی لوگوں کے مطابق لیفٹیننٹ گورڈن مر چکا تھا۔ زخمیوں میں خود رابرٹسن کے علاوہ کیپٹن کیمبل کا نام بھی شامل تھا۔ جنرل باج سنگھ اور میجر بیکم سنگھ کو شامل کر کے ایک سو چار مزید فوجی لقمہ اجل بن چکے تھے جبکہ تین سو ستر افراد زخمی تھے۔ ہم پُرسکون ہو چکے تھے اور ایلچی سے تمام معلومات لے کر رابرٹسن کی ہدایت کے مطابق اسے قلعہ دراسن کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ان سے ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ اب ہمارے اور قلعہ چترال کے درمیان کوئی دشمن موجود نہیں اور ہم باآسانی وہاں تک جا سکتے ہیں۔ اس خبر سے کیپٹن اسٹیوارٹ کے علاوہ سب کو خوشی ہوئی۔

---

[16] مصنف مروئے اور موری ناموں میں اُلجھاؤ کا شکار ہے۔۔ پل خراب ہونے کی وجہ سے وہ موری کیطرف جا ہی نہیں سکا تھا لہٰذا وہ مروئے میں اپنے قیام کر ذکر کررہا ہے اور نا م غلطی سے موری کا لکھا ہے۔

اب کسی بندے کو چترال بھیجنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ لہٰذا ہم نے ایک شخص کو اس پیغام کے ساتھ کہ کل یعنی 20اپریل کی دوپہر کو ہم قلعہ چترال پہنچ جائیں گے، چترال کی طرف بھیج دیا۔

محاصرے کے خاتمے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح کیمپ میں پھیل چکی تھی۔ ہم نے مستوج سے خط لے کر آنے والے نگر لیویز کے ہاتھوں یہ پیغام مستوج کی طرف روانہ کیا اور اس بات کے بارے میں سوچنے لگے کہ قلعے میں کیا ہوا ہو گا۔

مجھے نہیں پتہ کہ کسی دوسرے افیسر نے ایسا محسوس کیا یا نہیں لیکن مجھے شدت سے ایسا لگنے لگا کہ قلعہ چترال کے محصورین تک پہنچنے یا نہ پہنچنے کی نا قابل بھروسہ کیفیت اور کشمکش کے خاتمے کے ساتھ ہی اس مہم میں میری دلچسپی بھی دم توڑنے لگی تھی۔ میرا جھکاؤ اب اسٹیوارٹ کی طرف تھا کہ دشمن نے پیٹھ دکھا کر سارا مزہ کر کرا کر دیا۔ انہیں کسی بھی صورت ہمیں اتنی آسانی سے اپنے ہدف تک پہنچنے نہیں دینا چاہیے تھا۔ ان خیالات کے ساتھ چترالیوں کی بہادری پر سے ہمارا ایمان اُٹھ گیا۔

اگلی صبح (20اپریل کو) چھ بجے ہم روانہ ہوئے اور ایڈوانس پارٹی دوپہر تک وادی چترال میں داخل ہو چکی تھی۔ مرکزی دستے کو پہنچنے کا موقع دینے کی غرض سے آگے کا سفر روک دیا گیا۔ توپوں کو کاریتیرڑی کے خطرناک راستے سے نکالنے میں کافی دِقّت کا سامنا ہوا اور یوں کافی وقت انتظار کے بعد سب جمع ہو گئے۔

تقریباً دو میل مزید چلنے کے بعد ہمیں چترال کا پل نظر آگیا جو درست حالت میں تھا۔ وہاں سے ہم نے قلعے کے ایک مینار پر یونین جیک لہراتے ہوئے دیکھا۔ پل کی دوسری طرف ہم نے قافلہ روک لیا۔ بگل بجانے والوں کو آگے لایا، تمام دستے ساتھ ملا لیے اور باوقار انداز میں قلعے کی طرف مارچ شروع ہو گیا۔

قلعے کی فوج مرکزی دروازے کے سامنے ہماری منتظر تھی۔ یہاں پر اُن کی اپنے پرانے دوستوں سے ہاتھ ملانے اور قلعے کے دفاع کا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دینے کی خوشی کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

مختصر وقفے کے بعد ہم اپنے عارضی کیمپ میں داخل ہوئے جو ایک خوبصورت سایہ دار باغ تھا اور جہاں پانی کی بہتات تھی۔ جب جوان خیموں میں پُرسکون ہو گئے تو افیسر قلعے کے اندر چلے گئے جہاں موجود فوج نے ہمارے لیے بہترین ناشتے بلکہ لنچ کا انتظام کیا تھا۔ یہاں سنانے اور سننے کے لیے بہت کچھ موجود تھا اور پہلی بار ہمیں پتہ چلا کہ محصور قلعہ کن مشکل ترین حالات سے دوچار رہا۔ اس گفتگو میں ایک وقفہ اس وقت آیا جب کیپٹن اسٹیوارٹ نے ناامیدی اور بے بسی کی ملی جلی کیفت میں پوچھا "کیا اب بھی کسی جنگ کا امکان موجود ہے؟"

کھانے کے بعد ہم نے ارد گرد کی جگہیں دیکھیں اور فوجیوں سے انٹرویو کیے۔ ہم نے لیفٹیننٹ ہارلی کی بارودی سرنگ، حفاظتی مینار، مورچے اور چھوٹا سا ہسپتال سب کچھ دیکھ لیا۔ وہاں سے ہم نے مرکزی دروازے کے ٹھیک سامنے کیپٹن بیرڈ کی قبر پر حاضری دی اور پھر اپنے اپنے گھروں کو خط لکھنے بیٹھ گئے۔

میں نے چند فوٹو گراف لیے اور پھر سب چائے کی میز پر موجود تھے۔ میز پر وہسکی کی ایک بوتل رکھی تھی مگر اس میں گڑ کا شہد موجود تھا جو جیم اور مکھن کی عدم موجودگی میں ہمارا ساتھ دیتا تھا۔ وہسکی تو خیر قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ افیسران اور سپاہیوں کے کھانوں میں بھی سوائے الگ الگ لنگروں میں پکنے کے کوئی اور فرق نہیں تھا۔

اس رات ہم اس اطمنان کے ساتھ سوئے کہ اگلی صبح ہمیں کہیں نہیں جانا ہے۔ ہمارے جوتے گھسے ہوئے تھے اور پھٹے پرانے کوٹ اور کپڑے دھوبی گھاٹ میں لمبا عرصہ گزانے کے لیے ہر حوالے سے تیار تھے۔

یوں ہمارا کرنل کیلی کے ساتھ سفر اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ ہمارا یہ سفر مشکل ترین ہونے کے باوجود بہت زیادہ ناخوشگوار نہیں تھا اور میں اس سفر میں شمولیت پر خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔

اگلے دن کشمیر رجمنٹ قلعے سے نکل کر ہمارے ساتھ خیمہ زن ہوگئی جوان چلتے پھرتے ڈھانچے بن چکے تھے مگر پھر بھی پُر جوش تھے۔ وہ کئی دنوں تک اس تازہ ہوا کا مزہ لیتے رہے۔

اگلے چند دن میں قلعے کے مضافات میں گھوم پھیر کو فوٹو گرافی کرتا رہا۔ کچھ دنوں بعد تھرڈ بریگیڈ کے جنرل گیٹیکرے(General Gatacre) اور اس کے بعد جنرل لو(General Low) بھی ہیڈ کواٹر کے اسٹاف کے ساتھ پہنچ گئے۔ ان کی آمد پر ایک پریڈ کا انعقاد کیا گیا جس میں نو منتخب مہتر شجاع الملک بھی شریک تھے۔

چند دن بعد مجھے گلگت پہنچ کر کیپٹن بیرڈ کی جگہ ذمہ داریاں سنبھالنے کا کہا گیا۔ گو کہ اس سفر میں شریک لوگوں میں سے ہم دو تین ہی گلگت میں رہ گئے مگر اس مارچ میں موجود سب کے درمیان کالے گورے کے فرق سے بالاتر زندگی بھر قائم رہنے والا ایک رشتہ پیدا ہو چکا تھا۔

۔۔۔(اختتام)۔۔۔

Khowari is a non-profit project that aims to digitize and archive the history and literature of Chitral. Chitral, originally Chetrar, is the northernmost district of Pakistan, with a distinguished history and culture. Chitral is home to more than half a million Khow people who speak Khowar. Khowar-speaking people also live in some areas of Gilgit-Baltistan, which are adjacent to Chitral.

VISIT

www.khowari.com

Connect with us on Facebook, Instagram & X